طلوعِ اسلام

جولائی 1966

بتقریب سعید

عید میلادالنبیؐ

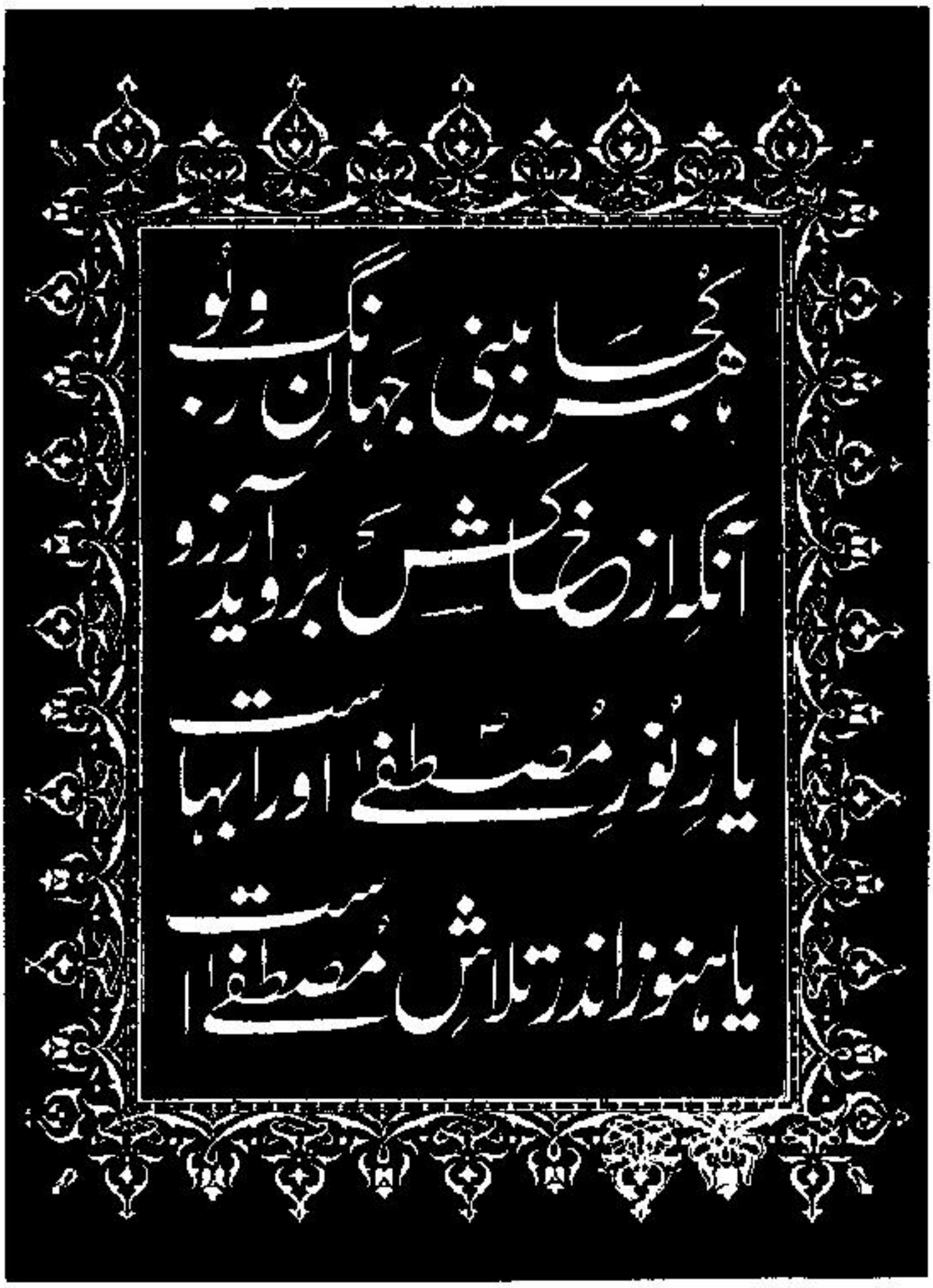

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

طلوع اسلام کی موجودہ اشاعت پانچ ہزار ہے ۔

اور جس رفتار سے یہ ملک میں مقبول ہو رہا ہے ، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی اشاعت کتنی تیزی سے اور بڑھے گی ۔ نیز اس کا ایک ایک پرچہ کئی کئی لوگ پڑھتے ہیں اور اس کا مطالعہ پاکستان اور بیرونی ممالک کے نہایت بلند پایہ طبقہ میں ہوتا ہے ۔ اس سے آپ اندازہ لگالیے کہ :

طلوع اسلام میں اشتہار دینے سے

آپ کے کاروبار کو کس قدر پبلسٹی مل سکتی ہے ۔ اشتہارات کے نرخ حسب ذیل ہیں :-

ٹائٹل	ایک بار	سال بھر کا ٹھیکہ
صفحہ نمبر ۲ ، ۳	۱۷۵ روپے	۱۵۰ روپے (فی اشاعت)
صفحہ نمبر ۴	۲۰۰ روپے	۱۷۵ روپے ,,

اندرونی صفحات

پورا صفحہ	۱۲۰ روپے	۱۰۰ روپے ,,
نصف صفحہ	۷۰ روپے	۶۰ روپے ,,

اجرت اشتہار مسودہ کے ساتھ پیشگی آنی چاہئے ۔ اگر کسی اشتہار کا بلاک بنوانا مقصود ہو تو بلاک کی اجرت الگ لی جائے گی ۔ غیر مہذب اشتہارات شائع نہیں کئے جائیں گے ۔

ناظم
ادارہ طلوع اسلام
۲۵- بی گلبرگ ، لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک

سالانہ پاک و ہند سے دس روپے

سالانہ غیر ممالک سے ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاک و ہند سے

ایک روپیہ

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت کا پتہ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵ ربی۔ گلبرگ لاہور

جلد ۱۹ جولائی سنہ ۱۹۶۶ء نمبر ۷

فہرست مضامین

(۱) لمعات ——— ۲

(۲) جمہوریت ——— ۲۰

(۳) آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ ——— ۳۰

(۴) طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد ——— ۳۱

(۵) 'رام راج' میں کیا ہوتا ہے؟ ——— ۳۳

(۶) رابطۂ باہمی ——— ۳۶

(۷) دین کی باتیں ——— (محترمہ ثریا عندلیب) ——— ۳۷

(۸) طلوعِ اسلام کے پمفلٹ ——— ۳۹

(۹) امریکہ کا عالمی کردار ——— (محترم خورشید عالم صاحب) ——— ۴۱

(۱۰) عصرِ حاضر کا بدنصیب انسان ——— ۵۱

(۱۱) زکوٰۃ (قرآن کی روشنی میں) ——— ۵۵

(۱۲) عمل ——— (محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب) ——— ۶۵-۸۰

ایڈیٹر صفدر سلیمی۔ ناشر سراج الحق بمقام اشاعت ۲۵ ربی۔ گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ ادارہ اشرف پریس۔ ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یہ گھڑی محشر کی ہے.....

قرآن کریم نے ایک عظیم اعلان کیا ہے۔ یعنی

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۶۱/۹)

خدا نے اپنے رسول کو ھدایت اور دین الحق دیکر بھیجا، تاکہ وہ تمام ادیان پر غالب آجائے خواہ یہ بات مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

اس اعلانِ عظیم میں، "دین" کے معنی "مذہب" کئے گئے اور مفہوم یہ لیا گیا کہ اسلام ایک مذہب ہے جو تمام مذاہبِ عالم پر غالب آجائے گا کیونکہ یہی سچا مذہب ہے۔ یہ دعوےٰ کیا اور اس دعویٰ کے اثبات کے لئے مختلف اہلِ مذاہب کے ساتھ مناظرے شروع ہو گئے۔ اور مناظروں کا جو انجام ہوا کرتا ہے وہ ظاہر ہے۔

قرآن کریم میں اسلام کو دین کہا گیا ہے، مذہب کہیں نہیں کہا گیا۔ مذہب اور دین میں جو فرق ہے اسے طلوعِ اسلام کے صفحات میں متعدد بار واضح کیا جا چکا ہے۔ خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو دین ملتا تھا۔ اسے بعد میں ان کے نام لیوا ــــ مذہبی پیشوا ــــ اپنی مرضی کے مطابق گھڑ لیتے تھے۔ دین کی اس مسخ شدہ شکل کا نام مذہب (RELIGION) ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت دنیا کا کوئی مذہب بھی دین نہیں رہا تھا۔ اس وقت بھی دنیا میں دین صرف اسلام ہے۔ ہماری بنیادی غلطی یہ تھی کہ ہم اسے مذاہب کی صف

میں لے آئے۔ اور اس کا مقابلہ دنیا کے مذاہب سے کرنے لگے ـــــ لیکن بات ہے بھی قابلِ فہم ۔ جو اسلام ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے وہ دین نہیں، مذہب ہے۔ اس لئے وہ جب اسے منجملہ مذاہب عالم شمار کرتے، اور اس کا مقابلہ دیگر مذاہب سے کرتے ہیں، تو وہ (بزعم خویش) سچے ہوتے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت صرف مذہب کو سمجھ سکتی ہے، دین کو نہیں سمجھ سکتی۔ مذہب نام ہوتا ہے چند نظری عقاید (DOGMAS) اور بے روح رسومات (RITUALS) کا، جن کا کوئی تعلق انسان کی دنیاوی زندگی سے نہیں ہوتا۔ ان سے مقصود آخرت میں نجات حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، دین، نظام زندگی کا نام ہے۔ یعنی وہ طور طریقہ، وہ نظم و ضبط، وہ قاعدہ اور قانون، وہ آئینِ انداز جس کے مطابق دنیاوی زندگی بسر کی جائے۔ تمدن، سیاست، حکومت، معاشرت، معیشت وغیرہ، انسانی زندگی کے مختلف نظام ـــ یعنی ادیان ـــ ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی مختلف شاخیں ـــ ملوکیت، آمریت، جمہوریت، سرمایہ دارانہ معیشت، سوشلزم، کمیونزم وغیرہ بھی ادیان ہی ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ انسانی زندگی کا ایک ہی نظام حق و صداقت پر مبنی ہے۔ اسے اسلام کہا جاتا ہے جو خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ملا۔ اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ باقی تمام ادیان (مختلف نظامہائے حیات) جو ذہنِ انسانی کے تراشیدہ ہیں، باطل ہیں ـــ اسلام ایک جامع نظام زندگی ہے جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ قرآن کا اعلان یہ ہے کہ انسان جتنے نظامِ زندگی جی چاہے وضع کرلے وہ ناکام ثابت ہوں گے اور اسے بالآخر اسی نظام کی طرف آنا ہوگا۔ جسے وحی خداوندی نے (قرآن کریم کے ذریعے) عطا کیا ہے۔ یوں یہ نظام، تمام نظامہائے حیات پر غالب آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ بہت بڑا ہے اور جو لوگ اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں (جسے ایمان کہا جاتا ہے) ان کا فریضہ ہے کہ وہ اس کی صداقت کا ثبوت پیش کریں۔ یہ ثبوت، مذہبی مناظروں کی رُو سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے تاریخ کے ٹھوس شواہد پیش کرنے ہونگے۔

[اس موضوع پر طلوع اسلام کے صفحات اور اس کی طرف سے شائع شدہ لٹریچر میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس مقام پر نہ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے نہ گنجائش۔ اس وقت ہم اپنے آپ کو صرف موضوع پیش نظر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔]

اس دین (اسلام) کے دیگر ادیان پر غالب آنے کے سلسلہ میں قرآن کریم نے دو صورتیں بیان کی ہیں یعنی اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ ـــ زندگی بخش خوشگوار نظریہ حیات، کے اندر اس امر کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ از خود اوپر کو اٹھتا چلا جائے ـــ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ـــ (۳۵/۱۰) لیکن اگر اس کے ساتھ انسانوں کا صلاحیت بخش پروگرام (اعمالِ صالحہ) بھی شامل ہوجائے تو اس سے وہ اور تیزی سے

اوپر اٹھ جاتا ہے۔ یعنی ان ہر دو طریق میں، فرق صرف رفتار کا ہوتا ہے۔ خدا کے عطا کردہ نظام کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا اور اوپر کو اٹھتا ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ انسانوں کی جماعت کے دست و بازو بھی شریک ہو جائیں، تو پھر وہ بڑی تیزی سے قائم اور متشکل ہو جاتا ہے۔

یہ نظام از خود جس رفتار سے آگے بڑھتا ہے اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ۔ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ۔ (خدا اپنی کسی اسکیم کو اپنے عالم امر میں مرتب کرتا ہے اور اس کی ابتداء سطح زمین پر، نقطۂ آغاز سے کرتا ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۔ (۳۲/۵) — پھر وہ اسکیم اپنے مرکز کی طرف بلند ہوتی چلی جاتی ہے، اور ایک ایک مرحلہ ایک ایک دن میں طے کرتی ہے۔ لیکن یہ "دن" چوبیس گھنٹے کا نہیں ہوتا۔ اس کی مقدار، تمہارے حساب و شمار سے، ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔ (دوسری جگہ اسے پچاس پچاس ہزار سال سے تعبیر کیا گیا ہے — ۷۰/۴)۔ تاریخی مراحل کے ماپنے کے پیمانے اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر قرآن کریم نے بتایا یہ ہے کہ خدا کا مقرر کردہ نظام، انسانوں کے خود ساختہ نظام پر غالب تو آتا ہے لیکن اس کے لئے بڑی لمبی مدت درکار ہوتی ہے۔ اگر "خدا کے حساب" سے اس کا ایک مرحلہ ایک دن میں بھی طے ہو جائے تو انسانی حساب سے یہ ایک ہزار سال کا عرصہ ہوگا۔ لیکن اگر کسی وقت انسانوں کی کوئی جماعت اس خداوندی نظام کو لے کر اٹھ کھڑی ہو، تو ہزاروں سالوں کی یہی مدت، سمٹ کر، ہمارے دنوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے متعلق حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخالفین سے کہا تھا (جو نہیں چاہتے تھے کہ نظامِ خداوندی ان کے مفاد پرستانہ نظام پر غالب آجائے)، کہ — يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ إِنِّيْ عَامِلٌ ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔ إِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۶/۱۳۶) — اے میری قوم! تم اپنے نظام کے مطابق کام کئے جاؤ، مجھے میرے نظام کے مطابق کام کرنے دو۔ نتائج بہت جلد سامنے آجائیں گے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ انجام کار کامیابی کس کی ہوتی ہے۔ اور خدا کا یہ دعویٰ کس قدر حق و صداقت پر مبنی ہے کہ جس معاشرہ میں کوئی شے اپنے ٹھیک مقام پر نہ ہے، وہ کبھی پنپ نہیں سکتا — اور تاریخ نے بتا دیا کہ نظامِ خداوندی اگر اپنی رفتار پر چلتا رہتا، تو وہ غلبہ جو اسے ہزاروں سال میں جا کر حاصل ہونا تھا۔ کس طرح دنوں میں حاصل ہو گیا کیونکہ اب اس نظام کو آگے بڑھانے اور اوپر اٹھانے کے لئے ایک جماعت وجود میں آچکی تھی۔

نظامِ خداوندی کے اپنی رفتار سے غلبہ حاصل کرنے میں اتنا ہی نہیں ہوتا کہ اس میں مدت بہت زیادہ

صرف ہو جاتی ہے۔ اس سے نوعِ انسانی کو جن جاں گداز مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان میں، اس کی متاعِ حیات — جان، مال، وقت، توانائی وغیرہ — کا بڑا ضیاع ہو جاتا ہے۔ یہ وہ طریق ہے جسے عام اصطلاح میں عقلِ انسانی کا تجرباتی طریق (EXPERIMENTAL PROCESS) کہا جاتا ہے۔ ذہن انسانی ایک نظام کو وضع کرتا ہے۔ اسے عملاً چلاتا ہے۔ دوسری قومیں اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔ باہمی تصادم ہوتا ہے۔ خونریزیاں، اور شعلہ انگیزیاں ہوتی ہیں، انسانیت تباہ و برباد ہوتی ہے۔ صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد جا کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام بھی انسانی تقاضے کو پورا نہیں کرتا۔ اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر ایک اور نظام وضع کیا جاتا ہے۔ وہ بھی انہی مراحل میں سے گزرتا ہے۔ اور آخر الامر ناکام ثابت ہوتا ہے۔ ذہن انسانی (TRIAL AND ERROR) کے اس طریق سے آگے بڑھتا چلا آتا ہے لیکن اس میں اسے خون کے دریا پیرنے اور آگ کی خندقیں پھاندنی پڑتی ہیں۔ اس طرح سینکڑوں ہزاروں سال کے بعد، کہیں جا کر وہ صحیح مقام پر پہنچتا ہے — اور یہ وہی مقام ہوتا ہے جسے وحیِ خداوندی نے شروع ہی سے تجویز کر دیا تھا۔ جس جذبۂ محرکہ کے ماتحت ذہنِ انسانی اپنے سابقہ پروگرام کو بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اسے عام اصطلاح میں "زمانے کا تقاضا" کہا جاتا ہے (ہیگل نے اسے "روحِ عالم" سے تعبیر کیا تھا۔ مارکس اسے "تاریخی وجوب" کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی HISTORICAL-NECESSITY) لیکن قرآن کریم اسے اسی پروگرام کی ایک کڑی قرار دیتا ہے جس کی رو سے دین الحق (نظامِ خداوندی) نے، ذہن انسانی کے تراشیدہ ادیان پر غالب آنا ہوتا ہے۔ عقل کے تجرباتی طریق کی رو سے آخر الامر صحیح مقام تک پہنچنے کا یہی وہ انداز ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا تھا کہ — یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ (۸۴/۶) — اے انسان! (تو اپنے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق چلے گا تو) بڑی جانکاہ مشقتوں کے بعد کہیں جا کر نظامِ خداوندی سے ملے گا۔ اگر اس کے خلاف، تو وحی کا مقرر کردہ راستہ اختیار کر لیگا تو ان تمام مشقتوں سے بچ جائیگا — وقت بھی بچے گا اور تباہیوں سے بھی محفوظ رہے گا۔

عقلِ انسانی کے وضع کردہ اور وحی کے تجویز فرمودہ طریقِ کار کا یہی وہ فرق ہے جسے اقبال نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ

هر دو امیرِ کارواں، هر دو بمنزلے رواں
عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں

جسے جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے وہ اس مقصد کے لئے اٹھتی ہے کہ دین الحق (صحیح نظامِ زندگی)

کے غلبہ کے لئے، عقل کے تجرباتی طریق کو چھوڑکر، وحی کا تجویز کردہ راستہ اختیار کرے اور اس طرح، اس نظام کے عملی نتائج کو سامنے لاکر، نوعِ انسان کو جگر پاش مشقتوں اور انسانیت سوز تباہیوں سے محفوظ رکھتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔

تاریخ کے آخری دور میں، یہ جماعت نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے متشکل ہوئی، اور اس نے صدیوں کے مراحل، دنوں اور ساعتوں میں طے کرکے، نظامِ خداوندی کو دیگر نظامہائے حیات پر عملاً غالب کرکے دکھا دیا ـــــ ملوکیت، غلامی، پیدائش کی رُو سے انسانوں کی تفریق، مرد اور عورت میں امتیازِ مدارج، مذہبی اقتدار، روحانی پیشوائیت، نظامِ سرمایہ داری، اور اسی قسم کے دیگر انسانوں کے خودساختہ نظریاتِ زندگی اور نظامہائے حیات، مغلوب ہوگئے۔ اور ان کی جگہ نظامِ خداوندی نے لے لی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مسلمانوں نے قرآنی راہ نمائی کو چھوڑ دیا[1]، تو مفاد پرست قوتیں پھر باہر نکل آئیں ـــ انسانوں کے تراشیدہ نظام ہائے زندگی (ادیان)، پھر ایک ایک کرکے نمودار ہوگئے اور دین الحق نے پھر اپنی سابقہ کائناتی رفتار سے چلنا شروع کر دیا۔ اس کی رفتار بیشک ہمارے حساب و شمار کی رُو سے سُست ہے لیکن اگر آپ اس ہزار سالہ تاریخ کا غور سے مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ، زمانے کے "تقاضوں" سے، انسانوں کے خود تراشیدہ تصورات اور نظامہائے زندگی کس طرح رفتہ رفتہ مٹتے جانے اور ماند پڑتے چلے رہے ہیں اور کاروانِ زندگی کا رُخ کس طرح اسی منزل کی طرف ہے جسے قرآن کریم نے متعین کیا تھا ـــــ مذہبی پیشوائیت کے خلاف لوتھر کی صدائے احتجاج، بادشاہت کے خلاف فرانس کا انقلاب، غلامی کے خلاف امریکہ اور اب اقوامِ متحدہ کی جدوجہد۔ درلوں (ذاتوں) کے امتیاز کے خلاف خود ہندوؤں کے ہاں کی آئینی تبدیلی۔ نسوانی حقوق کے متعلق عالمگیر ارتعاش، تسخیرِ فطرت سے توہم پرستیوں کا استیصال، نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھالنے کا تصور۔ نظامِ سرمایہ داری کے خلاف ہمہ گیر نفرت ـــــــ یہ سب اس حقیقت کی شہادات ہیں کہ انسان اپنے خود تراشیدہ ادیان سے تنگ آچکا ہے یا تنگ آتا جا رہا ہے۔ اور یوں، رفتہ رفتہ، غیر محسوس طور پر، دین الحق، فضا پر چھاتے جا رہا ہے۔ لیکن اس قدر کشمکش کے باوجود، ابھی تک زندگی کے کسی شعبہ میں بھی، دین الحق اپنی کامل اور مکمل شکل میں کہیں بھی متمکن نہیں ہوا ـــــ

---

[1] یہ کیسے ہوا ـــ؟ اس کی تفصیل پرویز صاحب کے مقالہ "اسلام آگے کیوں نہ چلا" میں ملے گی جو "سلیم کے نام خطوط" حصہ سوم میں شامل ہے۔

اس لئے کہ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، اس کی رفتار بڑی سُست ہے۔ اس کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے یعنی خدائی حساب وشمار کو انسانی حساب وشمار سے بدلنے کے لئے، اقبال نے مملکتِ پاکستان کا تصور دیا تھا۔ اس تصور کی بنیاد یہ تھی کہ اسلام پر عربی ملوکیت نے جو ٹھپہ لگا رکھا ہے، وہ اسی صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ دنیا میں ایک ایسی آزاد مملکت وجود میں آجائے جو صحیح اسلامی نظام کو متشکل کرے۔ اور اس طرح دین الحق، تمام غیر خداوندی ادیان پر غالب آجائے اور اس کے درخشندہ نتائج کو دیکھ کر انسانیت اس جہنم سے نکل سکے جس میں وہ بُری طرح گرفتار ہے۔ یوں تو اس جہنم کا ہر گوشہ انسانیت سوز ہے لیکن اس کا ایک باب ایسا ہے جس میں انسانیت کُش شقاوتیں اپنی انتہائی شدت کو پہنچ چکی ہیں ـــــ اور وہ باب ہے نظامِ سرمایہ داری کا۔ اس نظام کے خلاف، عقلِ انسانی کے تجرباتی طریق نے جو مہم شروع کی تھی وہ ہمارے زمانے میں اشتراکیت کی شکل میں نمودار ہوئی (جس کی آخری شکل کمیونزم ہے) اقبال نے اس تحریک کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ مارکس نے جس جذبہ کے ماتحت اس تحریک کو پیش کیا تھا اس میں انسانی ہمدردی اور دلسوزی کا عنصر بڑا فراواں ہے لیکن جن بنیادوں پر وہ اسے استوار کرنا چاہتا ہے وہ بڑی کمزور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے کبھی "پیغمبرِ بے جبرئیل" کہتا ہے، کبھی "کلیم بے تجلی" اور "مسیح بے صلیب" کہہ کر پکارتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ ـــــ قلبِ او مومن دماغش کافر است ـــــ اور کبھی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ـــــ نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب ـــــ (یہ الفاظ، وہ ابلیس کی زبان سے کہلواتا ہے) اُس زمانے میں روس، اشتراکیت کا علمبردار تھا۔ (چین ہنوز میدان میں نہیں آیا تھا)۔ آپ دیکھئے کہ علامہ اقبال، کس طرح روس کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہتے ہیں کہ تمہارے سامنے مقصد تو بے شک بڑا عظیم ہے، لیکن نہ تو تمہارے پاس ایسی وسیع عمارت کو استوار کرنے کے لئے کوئی محکم بنیاد ہے اور نہ ہی اس منزل تک پہنچنے کے لئے صحیح طریق کار ـــــ اس تصور سے کہ نظامِ سرمایہ داری کو کچلنے کے لئے اتنی بڑی طاقت میدان میں آگئی ہے انہیں بڑی خوشی ہوتی ہے لیکن اس خیال سے کہ اس طاقت کے پاس کوئی مثبت بنیاد نہیں، اس لئے وہ نظامِ سرمایہ داری کی قوتوں سے مات کھا جائے گی ان کا جگر خون ہو کر رہ جاتا ہے ـــــ دیکھئے: وہ کس طرح درد وغم میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں کہتے ہیں کہ ؎

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرفِ "لا" آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ

اس کے بعد حسرت ناک انداز میں کہتے ہیں کہ ؎

فکرِ اُو در تندِ بادِ لا بماند
مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند

پھر یہ کہہ کر اپنے آپ کو قدرے اطمینان دلا لیتے ہیں کہ ؎

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں

اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ؎

درمقامِ لا نیاساید حیات		سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا ساز و برگِ امتاں		نفیٔ بے اثبات مرگِ امتاں

وہ جاوید نامہ میں جمال الدین افغانیؒ کی زبان سے، روس کے نام ایک پیغام دیتے ہیں جس میں کہتے ہیں کہ ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی		دل ز دستورِ کہن پرداختی
ہم چو ما اسلامیاں اندر جہاں		قیصریت را شکستی استخواں

اس کے بعد افغانی نے جو کچھ کہا ہے اس سے ہر قلبِ حساس خون بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے۔ روس سے کہا ہے ؎

تا برافروزی چراغے در ضمیر		عبرتے از سرگزشتِ ما بگیر
پائے خود محکم گزار اندر نبرد		گردِ ایں لات و ہبل دیگر مگرد

کہنہ شد افرنگ را آئین و دیں
سوئے آں دیرِ کہن دیگر مبیں

بظاہر یہ الفاظ محض ناصحانہ نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت کہا یہ گیا ہے کہ یاد رکھو! محکم بنیاد کے بغیر یہ تمام جدوجہد یہ سعی و کاوش، صرف عارضی اور ھنگامی نتائج پیدا کر سکے گی۔ اس کے بعد افرنگ کا وہی سرمایہ دارانہ نظام غالب آجائے گا۔ اس انجام سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ؎

کردۂ کارِ خداونداں تمام		بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام

اے کہ مے خواہی نظامِ عالمے
جستۂ او را اساسِ محکمے؟

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان الفاظ میں طنز و تشنیع نہیں، دلسوزی اور جگر دوزی ہے۔ وہ ہزار دل سے چاہتے تھے کہ یہ تجربہ کامیاب ہو جائے تاکہ دنیا نظامِ سرمایہ داری سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اساسِ محکم کے بغیر یہ تجربہ کامیاب نہیں ہوگا اور اگر یہ تجربہ کامیاب نہ ہوا تو معلوم یہ نظامِ سرمایہ داری کتنے عرصہ تک اور انسانیت کے گلوگیر رہے۔ ان کی نگہِ دوررس دیکھ رہی تھی کہ افلاطون نے بلا اساسِ محکم اس کا تجربہ کیا تو وہ ناکام رہا، مزدک نے اسی طرح اس کا تجربہ کیا تو وہ بھی ناکام رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ روس اپنے پیشروؤں کے انداز کو چھوڑ کر، اپنی فکر و کاوش کو محمد رسول اللہ کے اختیار فرمودہ خطوط سے ہم آہنگ کر لے تاکہ یہ تحریک ناکام نہ ہونے پائے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ

> میرا خیال ہے کہ جب روس کا بحران ختم ہو جائے گا تو وہ اپنے نظام کے لئے کوئی مثبت بنیاد تلاش کر لے گا۔ چونکہ بالشویت کے ساتھ اگر "خدا" کو شامل کر دیا جائے تو وہ اسلام کے مماثل ہو جاتا ہے، اس لئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا اگر کچھ عرصہ کے بعد روس اسلام کو اپنے اندر جذب کر لے، یا اسلام روس کو ہضم کر لے۔

روس نے اس طرف توجہ نہ دی لیکن اس دوران میں اقبالؒ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ محمد علی جناح جس انداز سے ان کے پیش کردہ تصورِ پاکستان کو عملی شکل دے رہے ہیں۔ اس سے اس کے امکانات روشن ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی زمانہ (۱۹۳۷ء میں) قائداعظمؒ سے کہہ دیا کہ اس مملکت کو وجود میں لانے سے ان کا مقصد کیا ہے۔ وہ قائداعظمؒ کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

> اگر ہندوؤں نے سوشل ڈیماکریسی کو اپنے ہاں قبول کر لیا، تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم پھر سے اسلام کو اس کی منزہ شکل میں اختیار کر رہے ہیں۔

افسوس! کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ حصولِ پاکستان سے پہلے ہی دنیا سے تشریف لے گئے۔ لیکن یہ صدا مرتے دم تک ان کے لبوں پر تھی کہ ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات!

قائداعظمؒ نے بھی اقبالؒ کے اس پیغام کو فراموش نہیں کیا۔ وہ اپنی تحریروں میں، تقریروں میں اسے برابر دہراتے رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے، جولائی ۱۹۴۸ء میں، اسٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی زندگی کی آخری تقریر میں بھی اس کی وضاحت کی۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ وہ بھی چند دنوں کے بعد ہم سے رخصت ہو گئے اور جس مقصد کے لئے یہ مملکت وجود میں آئی تھی اس کی بنیادی اینٹ بھی اپنے ہاتھ سے نہ رکھ سکے۔

روس میں اشتراکی انقلاب ۱۹۱۷ء میں آیا۔ اس کے بعد اس کے غلغلہ اور طنطنہ کا یہ عالم تھا کہ ساری دنیا اس کی تلاطم انگیزیوں سے خوف زدہ تھی۔ یہ تحریک ساری دنیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جا رہی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے عین اس زمانے میں جب یہ اپنی کامیابیوں کے شباب پر تھی، کہا، اور برملا کہا، کہ یہ تحریک پنپ نہیں سکتی کیونکہ یہ کسی محکم اساس پر استوار نہیں۔ خطرہ ہے کہ یہ پھر اسی آئین افرنگ کی ہمنوا نہ ہو جائے جسے اس نے اس ...... تندومد سے توڑا ہے۔ اقبالؒ کو علم غیب نہیں تھا جو اسے اس کی پیش گوئی قرار دے دیا جائے۔ بات بالکل واضح ہے۔ قرآن کریم نے قوموں اور تحریکوں کے عروج و زوال کے متعلق اٹل قوانین دے دیئے ہیں جس شخص کی نگہ ان قوانین پر ہو، وہ کسی قوم یا تحریک کے آغاز یا اٹھان کے زمانے میں ہی کہہ سکتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ "قانون" کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں۔ انہی قوانین پر غور و تدبر سے انسان میں وہ فراست پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ــــ خلے دید داخل چمن گفت۔ ــــ اقبالؒ نے اسی قرآنی بصیرت کی بنا پر یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ نقشہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی وجہ بھی بدیہی ہے۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے مزدوروں کے دل میں سرمایہ داروں کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات کو مشتعل کیا اور جب وہ انتہائی شدت تک پہنچ گئے تو ان سے کہا کہ تم ان دولت مندوں کو لوٹ لو۔ یہ دولت سب تمہاری ہے۔ ان کی جگہ تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی۔ وہ، جذباتِ نفرت و انتقام سے بدمست، شعلۂ جوالہ کی طرح اٹھے اور جو کچھ ان کے سامنے آیا اسے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ یہ سب تخریبی پروگرام تھا۔ اس تحریک کا ابتدائی دور اسی پروگرام پر مشتمل تھا۔ اس دور کے ختم ہو جانے کے بعد، جب ان کے نفرت اور انتقام کے جذبات فرو ہو گئے، تو پھر ان کے لئے اس شدت اور جنون سے کام کرنے کا کوئی جذبۂ محرکہ نہ رہا۔ اسٹیلن کے دور میں، ارباب بست و کشاد کو ڈنڈے سے کام لینا پڑا۔ لیکن یہ حربہ کب تک کارفرما رہ سکتا تھا۔ اس کے بعد، انہوں نے اپنے مقام سے ہٹنا شروع کر دیا۔ پہلے اس تحریک کی بین الاقوامی حیثیت کو ختم کر کے،

اسے وطنی تحریک بنا دیا گیا۔ پھر، نظامِ سرمایہ داری کے ساتھ مفاہمت کی صورت پیدا کی گئی ـــ کہ تم اپنی جگہ راضی ہم اپنی جگہ خوش ـــ ان کی پارٹی کے اولین افراد نے انقلاب کی سختیاں جھیلی ہوئی تھیں اس لئے ان میں پھر بھی خلوص تھا۔ ان کی نئی نسل ان تمام جذبات سے عاری ہے۔ چنانچہ اگلے دنوں روس کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل مسٹر بریژنوف (BREZHNEV) نے اپنی پارٹی کے سامنے ایک رپورٹ پیش کی تھی جس میں کہا تھا کہ ہماری نژادِ نو کمیونزم کے احساسات و تصورات سے عاری ہو کر سرمایہ دارانہ تصورات کے آغوش میں جا رہی ہے۔ ان کا کوئی مؤثر علاج سوچنا چاہیئے۔ اس نئی نسل کا اندازِ زیست کیا ہے، اس کے متعلق امریکہ سے شائع ہونے والے رسالہ (NEWS WEEK) کی ۲ مئی ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس میں مقالہ نگار نے بڑے فخر و اطمینان سے کہا ہے کہ روس کے نوجوان ہمارے رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ اگر اس رپورٹ میں سے پراپیگنڈا کا عنصر کم بھی کر دیا جائے، تو بھی، خود بریژنوف کی شہادت کے پیشِ نظر، یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ روس کی نئی نسل اشتراکیت کے معیار پر پوری نہیں اتر رہی اور پھر اُسی نظامِ کہن کی طرف جا رہی ہے۔ اسی سے اقبال نے روس کو متنبہ کیا تھا جب کہا تھا کہ ؎

سوئے آں دیر کہن دیگر مبیں!

لیکن اساس محکم نہ ہونے کا یہ فطری نتیجہ تھا۔

علامہ اقبالؒ کی زندگی میں اشتراکیت روس تک محدود تھی اس لئے انہیں رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ اگر یہ تجربہ ناکام رہ گیا تو یہ انسانیت کے لئے کس قدر نقصان کا موجب ہوگا۔ یہ وجہ تھی کہ وہ انہیں بار بار "اساسِ محکم" کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ بایں ہمہ، جب وہ دیکھتے کہ خود زمانے کا تقاضا یہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری باقی نہ رہے تو انہیں اس کی امید بندھتی کہ اس نظام کے خلاف اٹھی ہوئی رَو اب واپس نہیں جائے گی۔ چنانچہ وہ (ضربِ کلیم) میں اپنی نظم بعنوان "اشتراکیت" میں کہتے ہیں۔

؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور!
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار!
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار!
جو حرفِ قُلِ الْعَفْوَ[1] میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اور اسی بنا پر وہ حتمی انداز میں کہتے تھے۔ کہ ؎

تدبر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے!

بلکہ یہاں تک کہ ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا ؛ تماشہ دکھا کر مداری گیا

جب وہ اپنی مشہور نظم ـــ فرمانِ خدا (فرشتوں کے نام) میں کہتے ہیں کہ ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمَراء کے در و دیوار ہلا دو

تو "فرشتوں" سے ان کی مراد وہی کائناتی قوتیں ہیں جو "زمانے کے تقاضوں" کی شکل میں رزمگاہِ تاریخ میں سامنے آتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دین کے اس معاشی نظام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہبی پیشواؤں کا وجود ہے ـــ خواہ وہ کسی مذہب کے بھی کیوں نہ ہوں۔ اسی لئے انہوں نے اس باب میں خاص طور پر کہا کہ ؎

حق را بسجودے ، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

---

[1] قرآن کریم میں ہے ـــ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ. قُلِ الْعَفْوَ ۔ (۲/۲۱۹) "یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زاید ہے، سب کا سب"۔ یہی اسلام کے نظامِ معاشی کی اصل و بنیاد ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) پر ہے اور قرآن فاضلہ دولت کسی کے پاس رہنے نہیں دیتا۔ علامہ اقبال کے اس شعر میں اسی طرف اشارہ ہے۔

لیکن وہ "چراغِ حرم و دیر بجھانے" کے بعد، فلسفۂ اشتراکیت کے مطابق منکرِ یزداں نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے وہیں اس کی وضاحت کر دی کہ ؎

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو!

وہ صحیح نظامِ معاشی کے قیام کے لئے "حرم" کا وجود ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن وہ حرم جو سرمایہ داری کی عطا کردہ "مرمر کی سلوں" سے مزین نہ ہو۔ محنت کشوں کے ہاتھوں مٹی کا تعمیر شدہ ہو۔

آپ نے غور کیا کہ اشتراکیتِ روس کی نامحکمی کے احساس سے، علامہ اقبالؒ کے دل میں کیا کیا حسرتیں کروٹ بدل رہی تھیں؟ اُن کے تصور کا پاکستان — جسے وہ دین کے معاشی نظام کا گہوارہ بنانا چاہتے تھے — وجود میں نہیں آیا تھا، اور دنیا میں دوسرا کوئی گوشہ ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اس کی تجربہ گاہ بن سکے۔ چین میں اُس زمانے میں جو تغیرات رُونما ہو رہے تھے اُن کے پیشِ نظر انہوں نے اس حقیقت کو تو بھانپ لیا تھا کہ ؎

ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے!
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے!

لیکن اُس وقت یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آخر الامر اس کی روش کیا ہوگی۔ اس مقام پر ایک بڑی دلچسپ چیز سامنے آتی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال (سفر افغانستان کے سلسلہ میں) حکیم سنائیؒ مرحوم کا مزار دیکھنے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے تاثرات اس نظم میں بیان کئے جو بالِ جبریل میں شامل ہے اس نظم میں خود حکیم سنائیؒ کا ایک مصرعہ اس انداز سے چسپاں ہو گیا ہے کہ ایسا نظر آتا ہے، جیسے اقبالؒ نے آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر دیکھ کر اسے دانستہ وہاں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
"گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا"

چینیوں نے اپنے ہاں اشتراکیت کو رائج کرتے وقت، رُوس کے تجربہ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ بڑی احتیاط سے دھیرے دھیرے چل رہے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ جو غلطیاں رُوس سے سرزد ہوئی تھیں ان کا اعادہ چین میں نہ ہونے پائے۔ لیکن جہاں تک اشتراکیت پر "ایمان" کا تعلق ہے، وہ ایسے ہی

"جنونی" (FANATICS) ہیں جیسے لینن کے زمانے کے اشتراکی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روس کو (جو اپنا پہلا موقف چھوڑ چکا ہے) "بدعتی" (REVISIONIST) قرار دے کر اسے سرمایہ پرست اقوام کی صف میں کھڑا کرتے ہیں اور اس سے، اس باب میں، کسی مفاہمت کے لئے تیار نہیں۔ جسے اپنے مسلک کی صداقت پر یقین ہو (خواہ وہ مسلک خود باطل ہی کیوں نہ ہو) وہ کبھی کسی دوسرے مسلک سے مفاہمت (COMPROMISE) کے لئے تیار نہیں ہوا کرتا۔

چینی روس کو مطعون کرتے ہیں کہ انہوں نے اشتراکیت کے حقیقی موقف کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ مختلف اسباب و علل کو اس کی وجہ قرار دیتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے اس کے اصلی اسباب تک ان کی نگاہ بھی نہیں پہنچ رہی ـــ اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی نگاہ از خود وہاں تک پہنچ بھی نہیں سکتی۔ روس کی اس "بدعت" یا "ارتداد" کی حقیقی وجہ خود اس فلسفہ کی بنیادی کمزوری ہے جس پر اشتراکیت کی عمارت اٹھائی جا رہی ہے۔ سوال نہ روس کا ہے، نہ چین کا۔ سوال اشتراکیت کے اس فلسفہ کا ہے جس کی رُو سے انسانی زندگی بس یہی طبعی زندگی سمجھی جاتی ہے، اور انسان کے "تقاضے"، اس کے صرف طبعی تقاضے۔ اس فلسفہ کی رُو سے، انسان کے سامنے نہ کوئی بلند اقدار ہیں، نہ غیر متبدل اصولِ حیات۔ کمیونزم کے معاشی نظام کا نصب العین یہ ہے کہ "ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کر کے پیدا کرے۔ لیکن اپنی اپنی کمائی میں سے بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر، باقی سب دوسروں کے لئے عام کر دے۔"

نہایت خوش آیند ہے یہ نصب العین اور بڑا بلند ہے یہ تصور۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جس کی وجہ سے انسان، جان مار کر کمائے اور اس میں سے بقدر اپنی (کم از کم) ضروریات کے رکھ کر باقی سب دوسروں کو دے دے۔ اشتراکیت کا فلسفۂ حیات، یہ جذبۂ محرکہ پیدا کر نہیں سکتا۔ اس کے ہاں اس قسم کی، اساسِ محکم، ہے نہیں۔ اس لئے اس قسم کے فلسفۂ حیات پر مبنی نظام معاشی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ آپ محنت کشوں اور مزدوروں کے جذباتِ نفرت و انتقام کو ابھار کر، کچھ وقت کے لئے ھنگامہ برپا کر سکتے ہیں۔ ایسا انقلاب پیدا نہیں کر سکتے جس میں قائم رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو۔ اس وقت چین اسی مقام پر ہے جس مقام پر لینن کے زمانے میں اہلِ روس تھے اُس زمانہ میں وہاں کے اربابِ حل و عقد، اشتراکی پارٹی کے وہ افراد تھے، جو نظامِ سرمایہ داری کے زخم خوردہ اور انقلابی جد و جہد کی چکیوں میں پس کر نکلے تھے۔ جب تک وہ لوگ باقی رہے، تحریک کی تلاطم انگیزیاں برقرار رہیں۔ جوں جوں وہ ختم ہوتے گئے، تحریک کا جوش بھی ٹھنڈا پڑتا گیا۔ اور اس طرح بعد میں آنے والے، تحریک میں ترمیم اور دوسروں کے ساتھ مفاہمت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ روس

نے اپنا مقام چھوڑا ہے تو اس میں وہاں کے راہ نماؤں کا کوئی قصور نہیں۔ اس کی وجہ اس تحریک کے فلسفہ کی بنیادی کمزوری ہے۔ اور اگر چین میں یہ تحریک اس وقت زوروں پر ہے تو اس لئے نہیں کہ اس تحریک کی بنیادی کمزوری رفع ہوگئی ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے چلانے کے لئے ہنوز وہ السابقون الاولون ـــ (PIONEERS) ـــ زندہ ہیں جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کی ہے۔ جوں جوں یہ لوگ ختم ہوتے جائیں گے، چین میں بھی وہی حالات پیدا ہوتے جائیں گے جو روس میں رونما ہوئے ہیں۔ اور یہاں بھی تحریک کا وہی حشر ہوگا جو روس میں ہوا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی حامل قوتیں اُسی دن کے انتظار میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انتہائی کوشش کر رہی ہیں کہ چین کے ساتھ ان کا کھلا ہوا تصادم زیادہ سے زیادہ عرصہ تک کے لئے ملتوی ہوتا چلا جائے تاکہ وہاں کی اشتراکیت بھی (روس کی طرح) اپنی اندرونی کمزوری کی وجہ سے پگھل پگھل کر بہ جائے۔

آپ شاید یہ کہیں کہ روس اور چین کی فکری آویزش، یا اشتراکیت کے مآل و انجام سے ہمارا کیا تعلق ہے جس کی بنا پر ہم نے اس موضوع پر اس تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری سمجھا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس مسئلہ کا تعلق "انسانیت" سے ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس کسی کا قرآن پر ایمان ہو وہ کسی ایسے مسئلہ سے لاتعلق نہیں رہ سکتا جس کا اثر عالمِ انسانیت پر پڑتا ہو۔ اس لئے کہ قرآن کریم "عالمِ انسانیت ہی کے فساد اور اصلاح کو اپنی راہ نمائی کا موضوع قرار دیتا ہے۔ قرآن کی رُو سے نظامِ سرمایہ داری، عالمِ انسانیت کے لئے بدترین فساد کا موجب ہے، اس لئے اس نظام کا مٹانا، قرآن پر ایمان رکھنے والوں کا اولین فریضہ قرار پاجاتا ہے۔ اس فریضہ کی سرانجام دہی، عہد محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ میں، نہایت حسن کارانہ انداز سے ہوئی۔ اور ان کی مملکت کے دائرے میں سرمایہ داری کے ابلیسی نظام کا نشان تک باقی نہ رہا۔ اس کے بعد، اُنہیں قرآن کے معاشی نظام کو عالمگیر بنانا تھا تاکہ عام انسانیت ان زنجیروں سے چھوٹ جائے جن میں اسے نظامِ سرمایہ داری نے جکڑ رکھا ہے۔ لیکن ہماری (اور ہمارے ساتھ، بلکہ ہماری وجہ سے عالمِ انسانیت کی) بدقسمتی، کہ یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی، اور دوسرے تو ایک طرف، ہم خود اُسی ابلیسی نظام کے شکنجے میں جکڑے گئے جسے ہم نے توڑا تھا۔ اب خدا خدا کرکے، زمانے کے تقاضوں سے، فضا اس غلط نظام کو مٹانے کے لئے ہموار ہوئی تھی، اگر ہم اس سے فائدہ اٹھاتے تو قرآن کے معاشی نظام کو اپنے ہاں نہایت آسانی سے رائج کر سکتے تھے جس کے انسانیت ساز نتائج کو دیکھ کر، باقی دنیا خود بخود اس طرف آجاتی۔ ہم

نے ایسا نہ کیا جس کی وجہ سے ہم، قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق، عدالتِ خداوندی میں دوہرے جرم کے مرتکب قرار پاگئے۔ (لَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَ أَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ۔ (۲۹/۱۳) — یعنے ایک جرم یہ کہ ہم نے اپنے ہاں صحیح قرآنی نظام رائج نہ کیا، اور دوسرا جرم یہ کہ عالمِ انسانیت، نظامِ سرمایہ داری کے جس جہنم میں گرفتار ہے، اسے اس سے نہ چھڑایا گیا۔ قرآن کریم نے یہ ہمارا فریضہ قرار دیا تھا جب کہا تھا کہ

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (۲/۱۴۳)

اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا ہے، تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال کی نگرانی کرو اور تمہارے اعمال کی نگرانی تمہارا رسول کرے۔

جب نبی اکرمؐ نے روم اور ایران کے شاہنشاہوں کو لکھا تھا کہ اگر تم نے اپنے معاشی نظام کو درست نہ کیا تو تمہارے ہاں کے زمینداروں کی طرف سے کاشتکاروں پر جو مظالم ہوتے ہیں، ان کی بازپرس تم سے کی جائے گی، تو اس سے ان کی توجہ ان کی اسی ذمہ داری کی طرف منعطف کرانا مقصود تھا۔

بہرحال، ہم نے ایسا نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نہ خود اس جہنم سے نکل سکے اور نہ ہی دنیا کو اس سے نکال سکے۔ اگر ہم نے اپنے ہاں قرآن کا معاشی نظام رائج نہیں کیا تھا تو کم از کم روس تک قرآن کی اس آواز کو پہنچا دیتے، کہ وہ اس نظام کے لئے کون سی اساسِ محکم تجویز کرتا ہے۔ ممکن تھا کہ وہاں کے اربابِ فکر و نظر اس آواز پر غور کرتے اور اپنے نظام کو قرآن کی اساسِ محکم پر استوار کر لیتے۔ لیکن ہم نے یہ بھی نہ کیا، لیکن اس کے بعد فطرت نے ہمیں ایک اور موقعہ دیا۔ یعنی اشتراکیت، روس سے سرک کر چین کی طرف منتقل ہو کر آگئی اور حسنِ اتفاق سے چین کے ساتھ ہمارے سیاسی تعلقات خوشگوار ہو گئے۔ ان حالات میں ہمیں اوّل تو یہ چاہیئے تھا کہ خود اپنے ہاں قرآن کی اساسِ محکم پر اس نظامِ معیشت کو قائم کر دکھاتے، لیکن اگر ہم سے ایسا نہیں ہو سکتا تھا تو کم از کم چین تک یہ آواز ہی پہنچا دیتے کہ جب تک آپ اشتراکیت کو قرآن کی تجویز کردہ بنیادوں پر استوار نہیں کریں گے، یہ نہ آگے چل سکے گی، نہ باقی رہ سکے گی۔ اور ایک ہی نسل کے بعد، چین میں بھی اشتراکیت کا وہی انجام ہوگا جو روس میں ہوا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ روس کے مقابلہ میں چین کے اربابِ فکر و نظر، کسی بھی خواہ کی آواز کو سننے کیلئے

زیادہ اچھے (Mood) میں ہیں۔ اس میں ایک خطرہ ضرور ہے کہ جب ہم ان سے ایسا کہیں گے تو وہ ہم سے پوچھیں گے کہ جب تمہارے ہاں ایسا نظام موجود ہے جو محکم بنیادوں پر استوار ہو سکتا ہے، تو تم اس نظام کو خود اپنے ہاں رائج کیوں نہیں کرتے ؟ ان کا یہ اعتراض واقعی وقیع ہوگا۔

اس کا جواب علامہ اقبالؒ کی نظم ـــــ ابلیس کی مجلس شوریٰ ـــــ میں موجود ہے۔ ہمارے نزدیک علامہ کی یہ نظم، ان کے مشاہدات کا ماحصل، ان کی فکر کا نچوڑ اور بیرایۂ بیان کے اعتبار سے بھی ایک نادر شاہکار ہے۔ اس میں انہوں نے، اشتراکیت کا تجزیہ کرنے کے بعد، ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ ؎

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

اس کے بعد، اُس مجلس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابلیسیت کو اس فتنہ (یعنی اسلام کے معاشی نظام) سے بچانے کے لئے کیا تدبیر اختیار کی جائے۔ ابلیس کہتا ہے کہ یہ کچھ مشکل نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ امّت حاملِ قرآن نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں!
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

اُسے خطرہ یہ ہے کہ ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

اس کی روک تھام کے لئے وہ جو پروگرام تجویز کرتا ہے وہ قابل غور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لئے ہمیں کرنا یہ چاہیئے کہ ؎

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اُس خدا اندیش کی تاریک رات

اس کے لئے تم مذہبی پیشوائیت کے حوصلے بڑھائے رکھو تاکہ وہ انہیں اس قسم کے مسائل میں الجھائے رکھے کہ ؎

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جُدا یا عین ذات

آنے والے سے مسیحؑ ناصری مقصود ہے
یا مجدّد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امّتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اِس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

المختصر یہ کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اِسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے

آپ تقسیم ہند کے وقت سے اِس وقت تک کے پاکستان کا موازنہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہاں ابلیس کے اس تجویز کردہ پروگرام پر کس شدت سے عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس سے آپ اس کا بھی اندازہ لگا سکیں گے کہ ع

یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی!

چین کے اس اعتراض کے جواب میں ہمیں نہایت دیانتداری سے کہہ دینا چاہیئے کہ اس نظام کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہبی پیشوائیت ہے۔ ہم اس کے شکنجے میں بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ اور اس سے پیچھا چھڑانے کی ہم میں ہمت نہیں لیکن تم اس سے پیچھا چھڑا چکے ہو اس لئے تم اسے بآسانی اختیار کر سکتے ہو۔ قرآن کریم کی رُو سے اِلّا اللہ کی منزل تک پہنچنے سے پہلے لَآ اِلٰہَ کے مرحلہ کو عبور کرنا نہایت ضروری ہے۔ تم اس مرحلہ سے آگے بڑھ چکے ہو لہٰذا، تمہارے لئے اِلّا اللہ کی اساسِ محکم کا اختیار کر لینا، ہماری نسبت زیادہ آسان ہے۔ ہم (بلکہ پورا عالمِ اسلام) اِس وقت تک لَآ اِلٰہَ کے گرداب سے نکل نہیں سکا اِس لئے ہمارا اِلّا اللہ تک پہنچنا دشوار ہے۔ تم اس لات و منات کو توڑ چکے ہو اس لئے تم اِلّا اللہ کی منزل کے زیادہ قریب ہو۔

یہ تھا ہمارے کرنے کا کام، لیکن واحسرتا! ہم سے اتنا بھی نہیں ہو سکا۔

اگر دنیا کے موجودہ حالات کا ذرا بدقت نظرِ تجزیہ کیا جائے تو یہ صورت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ چین میں اشتراکیت آخر الامر ماند تو پڑے گی، لیکن ہمیں ابھی کافی وقت لگے گا۔ اس دوران میں، چین نے جو اندازِ نگاہ اور طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے، اس سے منترشح ہوتا ہے کہ نوزائیدہ ممالک پر اشتراکیت اثر انداز

ہو کر رہے گی ——— اس لئے کہ کسی جگہ اگر فضا میں خلا پیدا ہو جائے تو اُسے پُر کرنے کے لئے جھکڑ آیا کرتا ہے۔ نوزائیدہ مملکتوں میں عوام کی معاشی بدحالی سے جو خلا پیدا ہو رہا ہے' اسے پُر کرنے کے لئے' اس وقت اشتراکیت کے جھکڑ کے علاوہ کوئی مؤثر عنصر فضائے عالم میں موجود نہیں ——— ہمیں دوسروں سے غرض نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ جھکڑ خود ہمارے ہاں بھی در آیا' تو اس سے' اسلامی تصورات حیات اور پاکستان کی آئیڈیالوجی' خس و خاشاک کی طرح اڑ جائیں گے۔ ہمارے لئے اِس طوفان بلا سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے ——— اور یہ وہی طریقہ ہے جسے اقبالؒ نے بہت عرصہ پہلے تجویز کیا تھا۔ یعنی (اشتراکیت + خدا = اسلام) کا فارمولا۔ بالفاظ دیگر، اشتراکیت کے معاشی نظام کو قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کی چار دیواری کے اندر رکھ کر نافذ کرنا۔ (تفصیل اس اجمال کی' ہم اس سے پہلے کئی بار پیش کر چکے ہیں[1]) اس سے نہ صرف یہ کہ ہم خدا فراموش اشتراکیت سے بچ جائیں گے' بلکہ' یہ بھی ممکن ہے کہ اقبالؒ نے جو خواب روس کے سلسلہ میں دیکھا تھا (کہ یا روس اسلام کو جذب کر لے گا یا اسلام روس کو)' اس خواب کی تعبیر سرزمین چین میں سامنے آجائے اور اسلام چین کو اپنے اندر جذب کر لے ہم اتنا اور واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ موجودہ معاشی نظام کو قرآنی نظام میں تبدیل کرنے کی اسکیم راتوں رات بروئے کار نہیں لائی جائے گی، یہ بتدریج ہوگا۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان اس منزل کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھ لے اور پھر اس کی طرف قدم بقدم آگے بڑھے۔ اس نصب العین کے تعین اور قرآن کی بنیادوں پر اس عمارت کی تاسیس ہی سے آپ دیکھیں گے کہ اشتراکی ذہن کس طرح بہ نوع دیگر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے!
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے!

---

[1] اس سلسلہ میں زیادہ نہیں تو پرویز صاحب کا خطاب "کمیونزم اور اسلام" ملاحظہ کر لیا جائے۔ جو طلوع اسلام کی مارچ ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اور ایک پمفلٹ کی شکل میں بھی موجود ہے۔

جمہوریت

ہمارے ہاں اکثر استفسارات موصول ہوتے رہتے ہیں۔ کہ مغرب کا جمہوری نظام، جس کا دنیا میں اس قدر شہرہ اور غلغلہ ہے، اور جس کی متابعت خود پاکستان میں بھی ہو رہی ہے۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے کیسا ہے۔ اس موضوع پر ہم جستہ جستہ متعدد بار لکھ چکے ہیں لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ اکثر مستفسرین، محفل طلوع اسلام میں نووارد ہیں اس لئے ان کی نگاہ سے ہماری وہ تحریریں نہیں گذریں۔ روز بروز آگے بڑھنے والی تحریکوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بعد میں آنے والے ان مقامات کی تشریح چاہتے ہیں جو سابقین کے نزدیک یکسر طے شدہ ہوتے ہیں۔ ان "تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" کی دقت کے پیش نظر ہم اس اعادہ کے لئے معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

قرآن کریم کا پیش کردہ سیاسی نظام بڑا صاف اور واضح ہے، قرآن کریم میں کچھ اقدار اور اصول دیئے گئے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان غیر متبدل اصول و اقدار کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، قوانین مرتب کرے۔ یہ اصول و اقدار (نیز وہ قوانین جنکا تعین خود قرآن کریم نے کر دیا ہے) ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے — ان میں تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کا حق، جمہور کی اکثریت تو ایک طرف، پوری امت (بلکہ ساری کی ساری نوعِ انسانی) کو بھی حاصل نہیں۔ یہ اصول و اقدار غیر متبدل رہیں گے اور ان کی روشنی میں وضع کردہ قوانین و ضوابط، حالات کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے بشرطیکہ ہر مقام پر یہ ہوگی کہ ان میں سے کوئی قانون، قرآن کی مقرر کردہ حدود سے نہ ٹکرائے۔ جہاں تک ان قوانین کی ترتیب و تدوین کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اتنا ہی کہا ہے کہ "یہ امت کے باہمی مشورہ سے ہوگا — اس مشاورت کی مشینری کیا ہوگی، اس کا تعین اس نے خود نہیں کیا، اسے امت کی صوابدید اور حالات کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی مملکت، قرآنی قوانین و اقدار کے

نافذ کرنے کی ایجنسی ہے۔ اس میں اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہے۔ یہی کفر و اسلام کا خطِ امتیاز اور حدِ فاصل ہے۔ قرآن کریم کے واضح الفاظ ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)

جو خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہی لوگ کافر ہیں۔

اس کے برعکس، مغربی نظامِ جمہوریت کو لیجئے۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ قوم کے نمائندگان کی اکثریت کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جو قانون جی چاہے بنا لے، جس میں جی چاہے ردّ و بدل کر دے۔ اور جسے جی چاہے منسوخ کر دے۔ بالفاظ دیگر، اس نظام کی رُو سے، قوم کے نمائندگان کی اکثریت کو اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) حاصل ہے اور ان کا یہ اختیار و اقتدار نہ کسی غیر متبدل اصول کے تابع ہے نہ کسی ناقابلِ تغیر قدر کا پابند۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام اور مغرب کے جمہوری نظام کے تقابل کے لئے اس سے زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جہاں تک پاکستان کے جمہوری نظام کا تعلق ہے، اسے سمجھنے کے لئے مغرب کے جمہوری نظام کے پس منظر کا سامنے لانا ضروری ہے۔ ازمنۂ متوسطہ میں، یورپ، چرچ (کلیسا) کے نظام میں بُری طرح جکڑا ہوا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ملک میں سیاسی اقتدارِ اعلیٰ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں تھا، بلکہ عوام کی معاشرتی زندگی کا ایک ایک بال ان کی مرضی اور منشا کی رسیوں سے بندھا ہوا تھا وہاں کے اربابِ فکر اس بدترین غلامی کے ہاتھوں سخت نالاں تھے لیکن اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی انہیں کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مذہبی پیشوائیت کے خلاف لب کشائی بدترین عذاب کو دعوت دینے کے مرادف تھی۔ بایں ہمہ، بعض حساس قلوب نے اس کی جرأت کی۔ اس کی پہلی مثال لوتھر کی صدائے احتجاج ہے۔ اس نے کہا کہ بائبل ہر انسان کے لئے روحانی راہ نمائی ہے اور چرچ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اس کی تعبیر اپنی منشا کے مطابق کرے اور پھر لوگوں کو اس تعبیر کے مطابق چلنے پر مجبور کرے۔ چرچ کی جکڑ بندیوں کو ڈھیلا کرنے کے لئے یہ پہلا جرأت مندانہ اقدام تھا۔ اسے بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے بعد انقلابِ فرانس نے وہاں کی بساطِ سیاست کا تختہ الٹنا چاہا تو انہوں نے محسوس کیا کہ معاملہ صرف حکومت کے شکنجوں سے رستگاری تک محدود نہیں، جب تک مذہبی پیشوائیت کو ایوانِ سیاست سے بے دخل نہیں کیا جائے گا، لوگوں کو حقیقی آزادی میسر نہیں آسکے گی۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف ملوکیت کا خاتمہ کر کے، عوام کو اپنی حکومت آپ قائم کرنے کا اختیار دلایا۔ اور دوسری طرف اس اعلان سے کہ مذہبی

پیشوائیت کو امورِ سیاست میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں، حلقوم انسانیت کو ان کے فولادی پنجوں کی گرفت سے نجات دلائی۔

اس پس منظر سے واضح ہے کہ کسی ملک میں جمہوری نظام قائم نہیں ہو سکتا جب تک وہاں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کو ختم نہ کر دیا جائے۔ آپ دنیا کے کسی ملک کی نشاندہی نہیں کر سکتے جہاں ان دونوں میں سے کسی ایک کا اقتدار قائم ہو اور وہاں کا نظامِ حکومت جمہوری ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا (ایسا کرنا اجتماعِ ضدین (آگ اور پانی کا یکجا کرنا) ہے۔

لیکن پاکستان کی کیفیت ساری دنیا سے نرالی ہے۔ انگریز کی حکومت میں، مذہبی پیشوائیت کو سیاست میں دخیل کار ہونے کا حق حاصل نہیں تھا۔ اس لئے وہاں ہماری غلامی، انگریز کی حکمرانی کی تھی، مذہبی پیشوائیت کی نہیں تھی۔ ہم نے انگریز کی حکمرانی کی زنجیروں کو توڑا تو اطمینان ہوا کہ اب ہم کسی کے غلام نہیں رہے۔ اب ہمیں پورا اختیار حاصل ہے کہ ہم اپنی زندگی، خدا کے مقرر کردہ اصول و اقدار کے تابع، اپنی مرضی کے مطابق بسر کریں۔ لیکن ملک کی بدقسمتی کہ یہاں (خاص سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق) مذہبی پیشوائیت نے اپنا جال بچھایا اور اسے ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر مسلط کر دیا — ان کا موقف یہ ہے کہ:-

(۱) پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں شرعی احکام نافذ ہونگے۔

(۲) شرعی احکام کا علم علماء ہی کو ہو سکتا ہے۔ اس لئے

(۳) یہاں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکتا جسے علماء کرام کی منظوری حاصل نہ ہو۔

جب ان سے کہا جائے کہ آپ مذہبی راہ نما ہیں۔ آپ کا کام لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا ہے۔ آپ اپنے آپ کو وہیں تک محدود رکھیئے۔ تو یہ جھٹ سے جواب دیتے ہیں کہ یہ تصور سیکولرازم کا ہے۔ اسلام میں مذہب اور سیاست میں کوئی مغائرت نہیں — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی — اس لئے آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سیاست مذہب کے دائرے سے باہر ہے۔

ان دلائل کا بودا پن ہم بعد میں واضح کریں گے۔ لیکن ان کی طرف سے یہ دلائل محض برائے وزن بیت دیئے جاتے تھے۔ ان کی اسکیم بہت گہری تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ

(۱) یہاں جمہوری نظام رائج ہوگا۔

(۲) جمہوری نظام میں حکومت انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے جن کے ساتھ اکثریت ہو۔

(۳) ہمارے ملک کی نوّے فیصد سے بھی زاید آبادی عوام (بلکہ جہلا) پر مشتمل ہے۔

(۴) اس لئے اگر عوام کو ہاتھ میں رکھ لیا جائے تو اقتدار ہمارے ہاتھ میں رہے گا۔

(۵) پاکستان کے عوام بڑے مذہب پرست ہیں۔ انہیں ساتھ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہاں مذہب کا چرچا زیادہ سے زیادہ کیا جائے۔

یہ تھی وہ اسکیم جس کے مطابق، مذہبی پیشوائیت نے اپنا تسلّط جمانے کے لئے "جہاد" شروع کیا۔ اس جہاد کے نتائج آپ کو پاکستان کے قریہ قریہ، بستی بستی، گلی گلی، کوچے کوچے میں نمایاں نظر آئیں گے آپ ذرا تقسیم ہند کے وقت اور آج کے پاکستان میں مذہبی پیشوائیت کا موازنہ کر کے دیکھئے، آپ کو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ اُس وقت محلہ کی مسجد کا امام سب سے زیادہ مسکین اور منکسر المزاج ہوتا تھا۔ اور آج وہ ان کے اعصاب پر سوار اور علاقہ بھر کے لئے دہشت کا موجب ہوتا ہے۔ اُس وقت ان کی تعداد بھی بہت کم تھی اور زندگی بھی انفرادی، آج ان کی تعداد لاکھوں سے بھی متجاوز ہے اور ان کی جماعت بندی تمام سیاسی جماعتوں سے زیادہ مضبوط۔ یہ خود (سردست) حکومت کی کرسیوں پر متمکن نہیں لیکن حکومت کی کرسیوں پر بیٹھنے والے ان سے ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہتے ہیں۔ ملک اور قوم کی بہتری کی کتنی اسکیمیں ان کے سامنے آتی ہیں، لیکن وہ محض ان کے ڈر سے انہیں بروئے کار لانے کی جرأت نہیں کرتے یہاں کوئی ایسا قانون پاس نہیں ہو سکتا جس سے یہ حضرات متفق نہ ہوں۔ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھ سکتا جسے ان کی تصویب حاصل نہ ہو، کوئی اخبار ایسا مضمون شائع کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا جس سے ان کی مخالفت کا احتمال ہو۔ ریڈیو ایسا پروگرام نشر نہیں کر سکتا جس سے ان کی پیشانی پر بل آنے کا خدشہ ہو۔ بڑے بڑے عمالِ حکومت کو محض انہیں خوش کرنے کے لئے مذہب پرست بننا پڑتا ہے۔ کوئی کسی بزرگ کے مزار کو غسل دے رہا ہے، کوئی کسی مکتب کا افتتاح کر رہا ہے، کوئی آیہ کریمہ کا ورد کرا رہا ہے، کوئی کسی محفلِ قرأت کی صدارت کر رہا ہے، کوئی الیکشن سے پہلے کسی سنگِ آستاں پر سجدہ ریز نظر آتا ہے۔ کوئی انتخاب میں کامیاب ہو جانے کے بعد، ان کے ختم دلا رہا ہے — آپ کہیں گے کہ اگر کوئی اپنی عقیدت مندی سے ایسا کرتا ہے تو اسے قابلِ اعتراض کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔؟ ٹھیک ہے — اگر یہ لوگ اپنی عقیدت مندی سے ایسا کریں تو کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہیں۔ لیکن یہ لوگ کہیں مرتبخ سے نہیں اترتے۔ ان کی زندگی ہمارے آپ کے اندر بسر ہوتی ہے۔ ان کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے انہیں کبھی کسی نے کسی مسجد یا خانقاہ میں نہیں دیکھا ہوگا — اور نہ ہی ان کرسیوں سے الگ ہو جانے کے بعد انہیں کہیں ختم پڑھتے یا سجدے کرتے دیکھا جائے گا، اِلّا اس کے کہ پھر الیکشن کا زمانہ قریب آجائے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ حضرات اپنی عقیدت مندی سے ایسا کرتے ہیں

یا مذہب پرست طبقہ کو خوش کرنے کے لئے ؟

سرسیدؒ نے قوم کو جہالت اور اوہام پرستی سے نکال کر اسے سائنٹیفک طریقِ فکر (SCIENTIFIC - THINKING) سے آشنا کیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ قوم میں اقبالؒ اور جناحؒ جیسے اربابِ فکر و نظر پیدا ہو گئے۔ اب قوم کو دھکیل دھکیل کر پھر اسی جہالت اور اوہام پرستی کے عمیق و تاریک گڑھوں میں پھینکا جا رہا ہے۔ مدرسوں اور کالجوں میں اسلامیات کے نام سے وہ کچھ پڑھایا جاتا ہے جس سے عقل و فکر کے چراغ گل ہو جائیں۔ ملک میں لٹریچر ایسا پھیلایا جا رہا ہے جس سے اعجوبہ پرستیاں وجہِ شرفِ انسانیت، اور شعبدہ بازیاں دلیلِ تکریمِ آدمیت قرار پائیں۔ طلسمِ ہوش رُبا کے وہ افسانے جنہیں خدا خدا کر کے قوم کے نہاں خانۂ دماغ سے نکالا گیا تھا، تقدس اور بزرگی کے لیبلوں کے ساتھ پھر سے ان کے قلب و دماغ کے ساتھ چپکائے جا رہے ہیں۔ اوہام پرستی کے نشانات جو خود زمانے کے ہاتھوں مٹ رہے تھے انہیں اوقاف کے روپے سے ازسرِ نو زندہ و پائندہ بنایا جا رہا ہے۔ گمنام مٹی کے تودوں پر سفیدیاں کرا کر انہیں مرجعِ خلائق بنایا، اور ان کی کشف و کرامات کے افسانے وضع کر کے قوم کے ذہنوں کو ماؤف کیا جا رہا ہے ـــ اربابِ قلم تاریخ کو مسخ کر کے یہ ثابت کرنے کی سعیِ ناکام میں مصروف ہیں کہ اسلام باقی ہی ان حضرات کی بدولت رہا ہے۔

غرضیکہ ساری قوم کو وہاں لے جایا جا رہا ہے جہاں یورپ آج سے پانچ چار سو سال پہلے تھا، جب اس کے اعصاب پر چرچ مسلط تھا۔ حکومت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ عوام کی ذہنی سطح کو بلند اور ان کی فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرے لیکن یہاں حکومت اس فکر میں رہتی ہے کہ وہ خود عوام کی سطح پر آ جائے۔ یہ سب کیوں کیا جا رہا ہے ؟ محض اس جمہوریت کی خاطر جس میں کامیابی اسے ہوتی ہے جس کے ساتھ اکثریت ہو۔ سوچئے کہ جس ملک میں اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ اقتدار و اختیار کا مطمحِ نظر یہ ہو کہ وہ عوام کی منشاء کے مطابق چلیں، وہ ملک ذرا بھی بلندی کی طرف جا سکتا ہے ؟ جہاں پامال راستوں پر آنکھیں بند کر کے چلتے جانے میں کامیابی کا راز ہو، وہاں ندرتِ فکر اور جدتِ کردار کی کوئی کرن بھی نمودار ہو سکتی ہے ؟ جہاں ہر نئی بات کو خدا کے خلاف بغاوت اور ہر نئے اقدام کو الحاد و بے دینی قرار دیا جائے وہاں جمود و تعطل کی برفانی سلیں کبھی ٹوٹ سکتی ہیں ؟ جہاں ہر سوچنے والے کو اس کا دھڑکا لگا رہے کہ نہ معلوم اسے کب مرتد قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کر دینے کا فتویٰ صادر ہو جائے، وہاں فکر و نظر کی صلاحیتیں کبھی پنپ نہیں سکتیں ! جہاں کے "دانشور" عوام کے اتباع میں اپنی خیریت دیکھیں، وہاں دانش و بینش کا نام بھی لیا جا سکتا ہے ؟

یہ کچھ کرتی ہے جمہوریت اس ملک میں جہاں مذہبی پیشوائیت کا اقتدار و تسلط ہو! لیڈر عوام کو اپنے پیچھے چلانے کے بجائے، خود عوام کے پیچھے چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور جس قوم میں مذہبی پیشوائیت کا دور دورہ ہو اس میں یہ لیڈر عوام کے پیچھے نہیں بلکہ درحقیقت ان کے مذہبی پیشواؤں کے پیچھے چلنے پر مجبور ہوتا ہے ـــ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ انتخاب میں ووٹ حاصل نہیں کر سکتا ـــ اور یہ مذہبی پیشوائیت وہ ہوتی ہے جن کے ہاں عقل و فکر سے کام لینا حرام ہوتا ہے۔ ان کی اپنی حالت یہ ہوتی ہے کہ زندگی کے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے عملی مسائل کے حل کرنے کے لئے بھی وہ دوسروں کی راہنمائی کے محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کی زندگی کے تمام اہم اجتماعی مسائل کا حل اُن کے فیصلوں کے مطابق ہو۔ وہ اپنے معمولی سے مقدمہ کی پیروی کے لئے وکیل ڈھونڈتے پھرتے ہیں لیکن ادعا یہ ہوتا ہے کہ ملک کے لئے قانون سازی کا حق ہمیں اور صرف ہمیں حاصل ہے۔ اب سوچئے کہ جس قوم کا موثر طبقہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ایسے عنصر کے پیچھے چلنے کے لئے مجبور ہو، دنیا کی زندہ قوموں میں اسکا مقام کیا ہوگا؟

پاکستان میں ڈیماکریسی یہی کچھ کر رہی ہے۔ اس سے آپ اس نکتہ کو بھی بخوبی سمجھ جائیں گے کہ یہ جو ہمارے ہاں مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جمہوریت کو عین اسلام قرار دے کر اسے محکم سے محکم تر بنانے کی جد و جہد کی جا رہی ہے، اس سے مقصود کیا ہے؟ اس سے مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس طریق حکومت میں، حکومت کا اقتدار، بالواسطہ، مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسلام کا سیاسی نظام یہ ہے کہ جو کچھ قرآن میں لکھا گیا ہے ـــ وہ غیر متبدل ہے اور بیشتر اصول و اقدار پر مشتمل۔ امت کا کام یہ ہے کہ وہ باہمی مشاورت سے ان اصول و اقدار کی روشنی میں، اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، اپنے لئے آپ قوانین و ضوابط مرتب کرے ـــ اس کے لئے مشینری کیا ہو، اسے امت خود تجویز کر سکتی ہے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ زمامِ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جو دلائل دیئے جاتے ہیں، ان کی حیثیت کیا ہے۔

اسلام کے سیاسی نظام کی رو سے، قوانین سازی کے لئے دو بنیادی شرائط کی ضرورت ہے یعنی قرآن کریم کے احکام و اقدار سے واقفیت اور اپنے زمانے کے احوال و کوائف پر نگاہ۔ آپ دیکھیں گے کہ مذہبی پیشوائیت ان دونوں خصوصیات سے عاری ہوتی ہے۔ قرآن کریم ان کے نصابِ تعلیم میں داخل نہیں ہوتا اور زمانے کے احوال و ظروف کو سمجھنے کے لئے جن علوم کی ضرورت ہوتی ہے یہ ان سے یکسر

نابلد ہوتے ہیں) اس طریق سے مرتب کردہ قوانین کی پوزیشن بھی اٹل نہیں ہوتی۔ امت کے دیگر ارباب فکر و نظر ان پر بحث و تمحیص کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے آئین میں یہ شق رکھی جا سکتی ہے کہ اگر کسی کو ان کے متعلق کچھ کہنا ہو تو وہ عدالتِ عالیہ کی طرف رجوع کرے۔ وہاں مخالف و موافق خیالات کے حامی بطور وکیل پیش ہوں۔ اور اپنے استدلالات عدالت کے سامنے رکھیں۔ لیکن فیصلہ عدالت پر منحصر ہو۔ واضح رہے کہ مسلمانوں کی پہلی حکومتوں میں بھی علماء کی حیثیت، مفتی یعنی وکیل کی ہوتی تھی۔ قاضی، یعنی فیصلہ دینے والے جج کی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب یہ حضرات، جج بھی نہیں بلکہ مملکت میں اقتدار آخر (SOVEREIGNTY) کی حیثیت اختیار کر رہے ہیں۔ سوچئے کہ اگر ملکی قوانین کی صورت میں یہی موقف وکلاء حضرات اختیار کر لیں تو ان کے اس دعویٰ کو کس دلیل سے رد کیا جائیگا۔ یعنی جس طرح علماء حضرات کہتے ہیں کہ چونکہ قوانین شریعت کا ہمیں علم حاصل ہے اس لئے قانون سازی کا آخری اقتدار ہمارے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ اسی طرح وکلاء حضرات یہ کہہ دیں کہ چونکہ ملکی قوانین کا علم ہمیں حاصل ہوتا ہے اس لئے ان قوانین کو صحیح یا غلط قرار دینے کا اختیار ہمیں حاصل ہونا چاہیئے، تو ان کے اس مطالبہ کو کس طرح مسترد کیا جا سکے گا؟

بہرحال، یہ ہے ہماری بصیرت کے مطابق اسلام کا سیاسی نظام اور اس کی روشنی میں جمہوریت کی پوزیشن، اس نظام میں، اقتدار اعلیٰ، قرآن کریم کی متعین کردہ حدود کو حاصل ہوتا ہے، کسی ڈکٹیٹر کی آمریت یا جمہور کی اکثریت کو حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن کے ماننے والوں کے نزدیک آمریت کا تو خیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جہاں تک قرآنی کنٹرول سے آزاد اکثریت کا سوال ہے، قرآن کریم اسے باطل قرار دیتا ہے۔ دیکھئے وہ اس حقیقت کو کیسے واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ..... (۶/۱۱۵)

"اے رسول! ان سے کہہ دو) کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں خدا کے علاوہ کسی اور کو فیصلہ دینے والا تسلیم کر لوں، جب کہ اس نے تمہاری طرف ایک ایسا ضابطہ قوانین نازل کر دیا ہے جو تمام امور کو نکھار اور اُجاگر کر بیان کر دیتا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ اسلامی نظام میں اقتدار اعلیٰ خدا کو حاصل ہوگا اور اس کی عملی شکل یہ ہوگی کہ اس کی نازل کردہ کتاب (قرآن کریم) کو ہر معاملہ میں حکم تسلیم کیا جائے۔ اس قرآن میں نہ صرف یہ کہ امور متعلقہ نہایت وضاحت سے بیان کر دیئے گئے ہیں بلکہ اس کی پوزیشن یہ ہے کہ :-

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ
وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۶/۱۱۵)

(۲) ــ انسان کے لئے جس قدر اصول وضوابط کی ضرورت تھی وہ سب اس میں دیئے جا چکے ہیں اور مکمل شکل میں دیئے جا چکے ہیں۔ ان میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں علاوہ ازیں وہ سب غیر متبدل ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

یہ دوسری شق سامنے آگئی۔ یعنی قرآنی ضابطہ واضح، مکمل اور غیر متبدل ہے اور غیر متبدل صرف اسی کے احکام و اصول ہیں۔ اس کے بعد ہے۔

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ
يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۔ (۶/۱۱۶)

(۳) ــ اگر تم اس موقف کو چھوڑ کر اکثریت کا اتباع کرو گے تو وہ تمہیں خدا کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔ اکثریت، محض ظن وتخمین کے پیچھے چلتی ہے۔ حتمی علم ویقین ان کے پاس نہیں ہوتا۔

قرآن کا یہ فیصلہ دنیا کی مروجہ جمہوریت کے متعلق قولِ فیصل ہے، بالخصوص ان کے لئے جو اوپر کی دونوں شقوں کو مانتے ہوں۔ مسلمانوں کی ہیئت حاکمیہ صرف قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی پابند ہوتی ہے۔ ان کے خلاف اکثریت کا فیصلہ ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا ــــ سورۂ حجرات میں ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ
الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ .... (۴۹/۷)

اسے اچھی طرح سن رکھو کہ تم میں جو خدا کا رسول موجود ہے، وہ اگر اکثر معاملات میں تمہاری اطاعت کرنے لگ جائے تو تم مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔

اور خود رسول اللہ سے کہہ دیا کہ:۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ (۵/۴۹)

تم ان کے معاملات کا فیصلہ خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق کرو۔ ان کے خیالات کا اتباع مت کرو۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ اول تو ہر غیر محدود جمہوریت (یعنی وہ جمہوریت جس میں اکثریت

کے فیصلے کسی غیر متبدل اصول کے تابع نہ ہوں) خلافِ اسلام ہے اور جس ملک کے عوام، مذہبی پیشوائیت کی گرفت میں ہوں وہاں جمہوریت اپنے عمومی نتائج بھی مرتب نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کی گرفت ازمنۂ مظلمہ (DARK AGES) کے بدترین استبداد کی یادگار ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ وہ اکاس بیل ہے کہ جس درخت پر مسلط ہو جائے' درخت خشک ہوتا جاتا ہے اور بیل بڑھتی پھولتی رہتی ہے۔ انسانیت پر جس قدر مظالم مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں "خدا کے نام پر" ہوئے ہیں' ابلیس کے حصہ میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ اس لئے جو ملک بھی آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہے' وہ اپنے ہاں کوئی نظام متشکل کرے' حصولِ آزادی کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنے ہاں سے اس اکاس بیل کو الگ کرے۔ آج یورپ جو اس طرح آسمان کی بلندیوں پر اڑتا جا رہا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے آزاد کر لیا ہے۔ جاپان' چین ہی کا حصہ ہے۔ ان دونوں کی حالت میں جو فرق ہے اس کی وجہ یہ ہے چین نے مذہبی پیشوائیت کے فولادی پنجہ سے رستگاری حاصل کر لی ہے۔ اور جاپان ہنوز اس کے چنگل میں گرفتار ہے۔ آج مسلم ممالک' دیگر آزاد ممالک کے مقابلہ میں' زندگی کے ہر میدان میں جو اس قدر پیچھے ہیں' تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کے قلب و دماغ پر مذہبی پیشوائیت کا تسلط بری طرح قائم ہے۔ اگر یہ صفِ آدمیت میں شریک ہونا چاہتے ہیں تو ان کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہوگا کہ اپنے ہاں سے مذہبی پیشوائیت کی اکاس بیل کو الگ کریں۔ مسلم مشاہیر میں سے مصطفےٰ کمال نے سب سے پہلے اسے محسوس کیا اور اپنے ہاں سے اس اکاس بیل کو الگ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ (بدقسمتی سے) اس کے سامنے قرآن کا صحیح سیاسی نظام نہیں تھا' اس لئے وہ اس خلاء کو جو مذہبی پیشوائیت کے استیصال سے وہاں پیدا ہو گیا تھا' قرآنی اقدار سے پُر نہ کر سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا نظام چل نہ سکا اور وہاں پھر یہ قوتیں ابھر آئیں۔ مغرب کی جمہوریت نے مذہبی پیشوائیت کو گرجے کی چار دیواری میں محبوس کر دیا ہے اور روس اور چین نے سرے سے اس بنیاد ہی کو اکھیڑ دیا ہے جس پر اس پیشوائیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ لیکن اس طرح سے پیدا شدہ خلاء کو یہ ممالک بھی پُر نہیں کر سکے۔ ان کے سامنے بھی وہ اقدارِ خداوندی نہیں جن سے یہ خلاء پُر ہوا کرتا ہے۔ اس سے ان سب کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ ؏

سینۂ بحر شگافید و بہ سینا نرسید

اس وقت دنیا کی نگاہیں متلاشی ہیں کسی ایسے صاحبِ ضربِ کلیم کی جو انسانیت کو فرعون، قارون اور ہامان (ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت) کے فولادی پنجوں سے نجات دلا کر، خالص اقتدارِ خداوندی کے مطابق عمرانی نظام قائم کر سکے۔ یہی انسانیت کا وہ عظیم محسن ہوگا جو جنت سے نکلے ہوئے آدم کو پھر سے جنت کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دے گا اور اس طرح خود بھی حیاتِ جاوید حاصل کرے گا۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ قرآن کریم کی مستقل اقدار کو اپنا غیر متبدل محاسب مقرر کرلے، اور منتخب اربابِ فکر و نظر کی مشاورت سے، مناسب تعلیم و تربیت کے ذریعے قوم کی ذہنی سطح کو بتدریج بلند کرتا چلا جائے تاکہ وہ یہ سمجھنے کے قابل ہو سکے کہ یہ مستقل اقدار کیا ہیں اور جن لوگوں کے ہاتھ میں زمامِ کار ہے، وہ ان کے مطابق چل رہے ہیں یا نہیں

دیکھیں! یہ سعادت کس کے حصہ میں آتی ہے؟

چند اہم کتابیں

۱۔ **اسبابِ زوالِ امّت**:۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ حقیقی اسلام کیا تھا اور اس کے بعد اس پر کیا گزری۔ یہ کتاب بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ قیمت۔ ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔

۲۔ **مقامِ حدیث**:۔ یہ الزام آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ طلوعِ اسلام "منکرِ حدیث" ہے لیکن اس کی تفصیل شاید آپ کو معلوم نہیں ہوگی کہ احادیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے یہ کس طرح مرتب ہوئیں اور کسطرح ہم تک پہنچیں۔ انکے اقرار اور انکار سے مراد کیا ہے۔ علمِ حدیث کے موضوع پر یہ کتاب بڑی جامع ہے قیمت ۱۲ روپے

۳۔ **اسلامی معاشرت**:۔ روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کے احکام کیا ہیں۔ انہیں بچوں، عورتوں کم تعلیم یافتہ لوگوں کیلئے نہایت سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت ۲ روپے۔

۴۔ **بہارِ نو**:۔ پرویز صاحب کے انقلاب آفریں، بصیرت افروز، دلکش مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت ۵ روپے۔

۵۔ **طاہرہ کے نام خطوط**:۔ عورتوں کی زندگی سے متعلق ہدایات اور احکام خطوط کی شکل میں، انداز دلکش، بیان سادہ، مضامین پُر مغز، راہ نمائی قرآنی ــــ قیمت حصہ اول دو روپے۔ حصہ دوم اڑھائی روپے۔

ان کتابوں پر محصول ڈاک الگ ہوگا۔ لیکن اگر آپ پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل ہیں تو پھر آپ کو محصول ڈاک نہیں دینا پڑے گا۔ (ناظم)

آنے والے دور کی دُھندلی سی اِک تصویر دیکھ

پاکستان میں علمائے کرام کا مطالبہ ہے (اور اس مطالبہ میں جماعت اسلامی سب سے پیش پیش ہے) کہ یہاں شرعی حکومت قائم کی جائے۔ ان حضرات کے تصور کی شرعی حکومت میں مسلمانوں کا حشر کیا ہوگا، اس کا اندازہ لگانے کے لئے آپ مودودی صاحب کے کتابچہ "مرتد کی سزا ——— اسلامی قانون میں" اٹھا کر دیکھئے۔ انہوں نے اسے تقسیم ہند سے پہلے لکھا تھا لیکن وہ پاکستان میں جون ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے صفحات [illegible] پر آپ کو یہ عبارت ملے گی۔

"اگر آگے چل کر کسی وقت اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو اور قتلِ مرتد کا قانون نافذ کر کے اُن سب لوگوں کو بزور اسلام کے دائرے میں مقید کر دیا گیا جو مسلمانوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اسلام کے پیدائشی پیرو قرار دیئے جاتے ہیں تو اس صورت میں بلا شبہ یہ اندیشہ ہے کہ اسلام کے نظامِ اجتماعی میں منافقین کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو جائے گی جس سے ہر وقت ہر غداری کا خطرہ رہے گا۔

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ (واللہ الموفق للصواب) کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد اُن سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائیگا اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہو بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں، انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عملِ تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔"

— اور "اسلام" کے معنی ہوں گے وہ طریقہ جسے یہ حضرات "اسلام" قرار دیں۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

(۱) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ، تمام نوعِ انسان کے لئے، قیامت تک، بلندیٔ اخلاق وکردار کا بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) ہے جس کے اتباع میں شرفِ انسانیت کا راز پنہاں ہے۔

(۲) احادیث کے مجموعوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور ضعیف بھی۔ جو روایت، قرآن کریم کے خلاف ہو یا اس سے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔

(۳) اُمت کے مختلف فرقے، اسلامی ارکان (نماز وغیرہ) کو جس طرح ادا کرتے چلے آرہے ہیں، ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کرنے، یا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ البتہ اگر کسی وقت خلافت علےٰ منہاج نبوت کا دوبارہ قیام ہو جائے اور وہ، امت میں پھر سے وہی وحدت پیدا کرنے کے لئے، جو ابتدائے اسلام میں تھی، ان کے لئے کوئی ایک طریقہ متعین کر دے تو اس سے امت کا موجودہ اختلاف اور انتشار ختم ہو جائے گا۔

(۴) جو مملکت اس امر کا اقرار و اعلان کرے کہ اس کا تمام کاروبار قرآن کریم کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے گا اور اس کا فریضہ قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہوگا۔ اور اس مملکت کے چلانے والے سیرتِ محمدیہ کے قالب میں ڈھلے ہوں، وہ مملکت صحیح اسلامی مملکت کہلائے گی اسی کو خلافت علیٰ منہاج نبوت یا اسلامی نظام کہا جاتا ہے اور اس کی سنٹرل اتھارٹی کو "مرکزِ ملت" کی اصطلاح سے پکارا جاتا ہے۔ اس کا طریق شورائی ہوگا۔

(۵) خلافت علیٰ منہاج نبوت یا اسلامی مملکت میں، تمام مسلمانوں کے لئے ایک قانونِ شریعت ہوتا ہے۔ مختلف فرقوں کے لئے مختلف قوانین نہیں ہوتے۔ اس میں، تمام مسلمان ایک امت کے افراد ہوتے ہیں۔ فرقوں میں بٹے ہوئے نہیں ہوتے۔ رسول اللہ کے زمانے میں اُمتیں

کوئی فرقہ نہیں تھا۔

(۶) اس وقت مختلف فرقوں کے اپنے اپنے قوانین شریعت ہیں۔ ان میں سے کوئی فرقہ کسی دوسرے فرقے کے قانون کو اسلامی قانون تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اندریں حالات، تمام مسلمانوں کے لئے واحد اور مشترک اسلامی قانون مدون کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ۔

(ا) قرآن کریم کو قانون کی غیر متبدل بنیاد قرار دے دیا جائے (مختلف فرقوں کا قرآن الگ الگ نہیں۔ قرآن سب کا ایک ہی ہے لیکن فقہ اور روایات ہر ایک کی الگ الگ ہیں۔)

(ب) قرآن کریم کو بنیاد قرار دے کر، مختلف فرقوں کی فقہ اور روایات کو سامنے رکھا جائے، اور ان کی روشنی میں ارباب علم و بصیرت کی مشاورت سے ایسا قانون مرتب کیا جائے جو ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

اس کے سوا، امت میں وحدت پیدا کرنے اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کی کوئی صورت نہیں۔

(۷) طلوع اسلام کا مسلک ہنگامے برپا کرنا نہیں، بلکہ دلائل و شواہد اور علم و بصیرت کی رُو سے قرآن کریم کی تعلیم کو اس طرح پیش کرنا ہے جس سے قلب اور دماغ میں صحیح تبدیلی پیدا ہو جائے، کیونکہ اس قسم کی تبدیلی کے بغیر، سیرت و کردار میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

(۸) طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے، نہ مذہبی فرقہ سے۔ نہ عملی سیاست میں حصہ لینا اس کے پروگرام میں ہے — پاکستان کا استحکام — ملت کی وحدت اور قرآن کریم کی بنیاد پر صحیح اسلامی نظام کا قیام، اس کا نصب العین ہے۔ اس نظام کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا اس میں وہ ہر نوع غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ طلوع اسلام کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے سوچنے والے طبقہ کے دل و دماغ میں ایسی تبدیلی پیدا کی جائے جس سے وہ یہاں آئینی طور پر صحیح اسلامی نظام متشکل کر سکیں۔

(۹) اس مقصد کے لئے طلوع اسلام کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ البتہ جو حضرات بطیب خاطر اس مقصد سے متفق ہوں وہ انہیں دعوت دیتا ہے کہ وہ اس فکر کی نشر و اشاعت کے لئے اس سے تعاون کریں۔

ناظم — ادارہ طلوع اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

"رام راج" میں کیا ہوتا ہے؟

سید بدرالدجےٰ، مغربی بنگال (ہندوستان) کے ایک ممتاز مسلم راہ نما ہیں۔ بہت پرانے کانگریسی، آزادی کی جنگ میں، ہندوؤں کے چوٹی کے لیڈروں کے ساتھ شانہ بشانہ لڑنے اور جیل جانیوالے، کانگریسی ہونے کی وجہ سے تقسیم ہند کے وقت ہندوستان میں رہے۔ اب وہاں کی مرکزی پارلیمان کے رکن ہیں۔ انہوں نے پچھلے دنوں پارلیمان کے بھرے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے، ایک تقریر کی، جو اس قابل ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں، ہر شریف انسان تک پہنچائی جائے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں، جمہوری حکومت کے نام لیواؤں اور "رام راج" کے پرستاروں کے ہاتھوں، وہاں کے مسلمانوں پر کیا بیت رہی ہے۔ ہم اس تقریر کو اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ ہمارے ہاں کی نئی نسل کو یہ معلوم ہو جائے کہ اگر اس قوم میں اقبالؒ اور جناحؒ پیدا نہ ہوتے، تو آج اس ملک میں ہمارا کیا حشر ہوتا۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ ہندو کیوں سانپ کی طرح بل کھا رہا ہے کہ (خاکم بدہن) کسی نہ کسی طرح پاکستان کا وجود ختم ہو جائے اور یہاں کے آٹھ کروڑ مسلمان بھی اس کی ہوسِ انتقام کا شکار بن سکیں۔ خدا ہمارے اس حصارِ ملت کو ابدالاباد تک قائم و دائم رکھے کہ اسی کے سایے میں ہماری جان، مال عزت۔ آبرو محفوظ ہے۔

سید بدرالدجیٰ نے اپنی تقریر میں انکشاف کیا کہ پاکستان اور بھارت کی جنگ کے دوران پچاس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو پاکستان کا جاسوس قرار دے کر غداری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس دوران بھارت میں جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہوئے اور ہندو غنڈوں نے مسلمانوں پر مظالم توڑنے کے تمام سابقہ ریکارڈ مات کر دیئے۔ سید بدرالدجیٰ نے بھارت کی لادینیت کو مکاری، عیاری اور بے حیائی قرار دیا ہے اور کہا کہ لادینیت کی آڑ میں بھارت سے مسلمانوں کو ختم کیا جا رہا ہے۔

دفاعی قوانین

انہوں نے کہا کہ وزیر داخلہ مسٹر نندا کا یہ اعلان ....کہ دفاعی قوانین سرحدی صوبوں میں برقرار رہینگے انتہائی افسوسناک ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک سرحدی حلقہ انتخاب کی نمائندگی کرتا ہوں۔ بدقسمتی سے مرشد آباد پاکستان کی سرحد پر واقع ہے۔ چونکہ میں مرشد آباد کا رہنے والا ہوں اس لئے میں بھی دفاعی قوانین کا شکار بن گیا ہوں۔ ذاتی طور پر مجھے اس کی پرواہ نہیں میں اس مہربان حکومت کے ہاتھوں چار بار جیل جا چکا ہوں۔ چند بار اور سہی۔ پھر یہ کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اور کار روانِ حیات آخری منزل میں ہے۔ مگر میں ان لاکھوں مسلمانوں کے بارے میں فکرمند ہوں۔ وہ مسلمان جو معصوم اور بے گناہ ہیں۔ جن میں پروفیسر، ڈاکٹر انجنیئر، اخبار کے ایڈیٹر، سرکاری افسر، ہائی کورٹ کے وکلاء، صنعت کار شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دفاعی فنڈ میں دل کھول کر چندے دیئے۔ لیکن اس کا انعام یہ ملا کہ ہمیں جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ نہ تو ہم نے کسی سازش میں حصہ لیا اور نہ ہی ہم کوئی تحریک چلا رہے تھے۔ گرفتار ہونیوالوں میں ستر اور پچھتر سال کے ایسے بوڑھے بھی ہیں جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ ان کا قصور کیا ہے۔ صرف یہ کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس ملک میں ایک قانون شکن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مدافعت کر سکے۔ ایک ڈاکو، چور، قاتل، نقب زن قانون کا تحفظ حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں۔ حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں بھارت کا دستور اپنا شہری مانتا ہے۔

مسلمانوں کا قتل عام

آج آزادی کو حاصل کئے ہوئے ۱۹ سال ہو گئے ہیں لیکن مسلمانوں کا قصور معاف نہیں کیا گیا۔ ان اُنیس سالوں میں پولیس کی بے امتیاز فائرنگ انگریزوں کی ڈیڑھ سو سالہ روایات کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ پورے ملک میں قتل و غارت گری، جھوٹی یقین دہانیاں، لوٹ مار کے دلدوز مناظر، ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام، بغیر کسی امتیاز کے لاکھوں کی گرفتاری، آسام مغربی بنگال سے بے دخلیاں اور اسی قسم کے دوسرے ہزاروں واقعات مسلمانوں سے موجودہ سیکولر حکومت کے جانبدارانہ سلوک کے ثبوت ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ایک اچھے اور ملک کے وفادار شہری کا کردار ادا کیا ہے۔ ان کا مذہب انہیں غداری نہیں سکھاتا۔ لیکن مجھے بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ اکثریت انہیں غدار سمجھتی اور حکومت ہم سے غداروں کا سا سلوک کرتی ہے۔ ہم دوسرے درجہ کے شہری ہیں ہماری

جگہ علی پور ریذیڈنسی جیل اور بھارت کی دوسری جیلیں ہیں۔ ہماری عزت آبرو برسرعام نیلام کیجاتی ہے اور افسوس کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہم اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتے، ہم احتجاج نہیں کر سکتے۔ ہم اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ افسوس دنیا میں اس سے زیادہ مظلوم اقلیت شاید ہی کوئی ہوگی۔

مسلمانوں سے الجھ کر ہماری حکومت یہ سمجھتی ہے کہ اس نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے حالانکہ سرحدی حکومتوں سے دشمنی رکھنا عقلمندی نہیں۔ ہماری حکومت بین الاقوامی پیچیدگیوں کا اندازہ کرنے میں ناکام رہی ہے۔ راج گوپال اچاریہ، اچاریہ کرپلانی اور دوسرے بڑے بڑے رہنماؤں کے توجہ دلانے کے باوجود صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کی۔

غلاموں کا درجہ

انہوں نے آگے چل کر کہا کہ اگرچہ ملک کی دیگر اقلیتوں کا بھی یہی حال ہے لیکن مسلمانوں کی حالتِ زار کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے حتیٰ کہ یہاں کوئی مسلمان اپنی جائیداد فروخت نہیں کر سکتا اور اس کے لئے اسے شہریت کا سرٹیفکیٹ پیش کرنا پڑتا ہے ستمبر کی جنگ کے دوران اور اس کے بعد تو صورتِ حال اور بھی خراب ہوگئی مسلمانوں کو سیاسی کوڑھی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس ملک میں ان کی حیثیت قدیم اسپارٹا کے غلاموں جیسی ہے۔ وہ قابلِ مذمت اور قابلِ لعنت ہیں۔ انکا صحیح مقام کوڑا گھر یا جیلیں ہیں۔

مسلمان ہونا جُرم ہے

یہ انکشاف شاید لوگوں کو حیرت میں ڈال دے کہ جنگ کے دوران مغربی بنگال میں ۲۰ ہزار پاکستانی موجود تھے ان میں سے دس ہزار نظر بند کئے گئے کیونکہ وہ مسلمان تھے۔ ہندو بھائیوں کو پاکستانی ہونے کے باوجود کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ کونسی شرافت ہے۔ کیا وزیر داخلہ اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟ کیا ان کے قریب مسلمان ہونا جرم ہے؟ لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تاریخ کا پہیہ بڑی سست رفتاری سے چلتا ہے مگر پیستا بہت باریک ہے۔ ہم کمزوروں کے استیصال کے نتیجہ میں یہ حکومت پستی کے غار میں ایسی گرے گی کہ پھر نہ اٹھ سکے گی۔

تقریر کے آخر میں مسٹر بدالدجیٰ کی آواز بھرا گئی۔ انہوں نے کہا کہ میں بوڑھا، ضعیف اور بیمار ہوں۔ میں نے ساری عمر کانگریس میں گزاری۔ بڑے بڑے رہنماؤں کے شانہ بشانہ ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کی گاندھی اور نہرو کے ساتھ کام کیا لیکن افسوس آج میری تمام امیدیں اور خواب پاش پاش ہو چکے ہیں۔ (بحوالہ "مشرق" ۲۱/۵/۶۶)

رابطہ باہمی

حادثۂ الم انگیز

یہ خبر نہایت حزن وملال کے ساتھ سنی جائے گی کہ محترم این۔ ایم۔ انور گارڈ۔ روھڑی۔ کی اچانک وفات ہوگئی۔ مرحوم گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔ طلوع اسلام کی قرآنی فکر سے انہیں بڑا لگاؤ تھا اور اسے عام کرنے میں بڑی مخلصانہ جدوجہد کرتے تھے۔ ان کی وفات سے، یہ قرآنی قافلہ ایک اچھے رفیقِ سفر کی رفاقت سے محروم ہوگیا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔

بزم جلہ جیم

جلہ جیم۔ تحصیل ملسیاں۔ ضلع ملتان۔ میں ایک جدید بزم کا قیام عمل میں آیا ہے۔ حکیم قمرالزمان ثقلینی صاحب اس بزم کے نمایندہ منتخب ہوئے ہیں۔ حکیم صاحب کو طلوع اسلام کی قرآنی فکر سے دیرینہ وابستگی ہے۔ امید ہے ان کی راہ نمائی میں بزم اس فکر کی نشر واشاعت کے لئے نمایاں خدمات سرانجام دے گی۔ ادارہ اس بزم کے قیام کی تصویب کرتا ہے۔

بزموں کی مساعی

تمام بزمیں، رسالہ کی اشاعت کے سلسلہ میں پورے جذب وانہماک سے کام لے رہی ہیں اور یہ اسکیم بڑی کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ادارہ ان کی مساعی جمیلہ پر ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔ مختلف مقامات پر ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ پرویز صاحب کے درس قرآن کریم کا سلسلہ بھی حسن وخوبی جاری ہے۔ لاہور کی بزم، رسالہ کی اشاعت کے سلسلہ میں خاص طور پر ادارہ کا ہاتھ بٹا رہی ہے جس کے لئے وہ مستحق سپاس گذاری ہے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

دین کی باتیں

پرویز صاحب کا ہفتہ واری درس قرآن کریم، علم و بصیرت کا ایک ایسا سمندر ہے جس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جنہیں اس میں شرکت کا موقعہ ملا ہے مجھے اپنی اس خوش بختی پر ناز ہے کہ میں اس سے مسلسل بہرہ یاب ہو رہی ہوں۔ یوں تو اس درس میں وہ کون سی بات ہے جو یاد رکھنے کے قابل نہیں ہوتی لیکن بعض نکات ایسے ہوتے ہیں جو خود بخود ذہن کے ساتھ چپک جاتے ہیں۔ میں ایسے نکات کو اکثر ضبطِ تحریر میں لاکر محفوظ کر لیا کرتی ہوں۔ میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان نکات کو ان حضرات کے علم میں بھی لایا جائے جو درس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ذیل میں چند ایک نکات درج کئے جاتے ہیں۔ اگر احباب نے انہیں مفید پایا تو میں اس سلسلہ کو جاری رکھونگی

(ثریا عبدالطیف)

(۱) دین تو شروع سے ایک ہی رہا۔ یہ ایک ہی تھا۔ ایک ہی ہے اور قرآن کی دفتین میں محفوظ ہمیشہ کیلئے ایک ہی رہے گا۔ دوسرے تمام مذاہب دین کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ دین اپنی اصلی شکل میں اسلام کے نام سے قرآن کے اندر موجود ہے ۔ اسلام دین ہے مذہب نہیں ہے۔

(۲) دنیا میں فرعونیت چل ہی نہیں سکتی تاوقتیکہ مذہبی پیشوائیت اس کے ساتھ نہ ہو۔ کوئی فرعون ہامان کے بغیر حکومت نہیں کر سکتا۔

(۳) مومن کا ہر سانس، ہر قدم اس کا ہر ارادہ اور ہر عمل اس مقصد کے لئے ہوتا ہے کہ اس سے خدا کی صفتِ رحمانیت کا دنیا میں ظہور ہو جائے۔ یعنی ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما ہو جائے۔

(۴) ہر وہ دیدہ ور جو اپنی نگاہوں کو غیروں کے تصورات و خیالات سے پاک کر لے اور پھر قرآن کریم کی روشنی سے دنیا کو دیکھے، اسے وہ بصیرت حاصل ہوتی ہے جس کا ایک عام نگاہ احاطہ نہیں کر سکتی۔

(۵) جھوٹ کبھی جھوٹ کی شکل میں لوگوں کو فریب نہیں دے سکتا وہ ہمیشہ سچ کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتا ہے۔ جھوٹ بے نقاب فریب نہیں دے سکتا۔

(۶) ابلیسی نظام دین کی اصطلاحات نہیں بدلتا۔ وہ الفاظ کو زندہ رکھتا ہے لیکن ان کے معانی مسخ کر دیتا ہے۔ وہ رسوم کو قائم رکھتا ہے، ان کی روح کھینچ لیتا ہے۔

(۷) اسلامی جمہوریت کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کریم کی متعین کردہ حدود کو عوام کے ذہنوں میں پیوست کیا جائے۔

(۸) تسخیرِ فطرت مقامِ آدمیت ہے اور ان قوتوں کو وجہ تزئینِ انسانیت بنانا فریضۂ مومن — آدم کے سامنے ملائکہ جھکتے ہیں لیکن مومن کے سامنے ملائکہ اور ابلیس دونوں جھک جاتے ہیں۔

(۹) دنیا میں وہی عمل بقائے دوام کا مستحق ہو سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

(۱۰) قرآن کریم کا پروگرام تمام نوعِ انسان کو امتِ واحدہ بنانا ہے۔

(۱۱) دیانت کی خاطر دیانت اختیار کرنے والے کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ دوسرے اس کے جواب میں کیا کرتے اور کیا کہتے ہیں۔ صداقت کی خاطر صداقت پر قائم رہنے والے کو یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ مجھے اس کا صلہ کیا ملے گا۔

(۱۲) دنیا کے تمام وہ لوگ جو مستقل اقدارِ انسانیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہوں، ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور تمام ایسے لوگ جو اس اصول سے انکار کریں، دوسری قوم کے افراد۔

(۱۳) دینداری کا معیار یہ ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کس قسم کا ہے۔

(۱۴) جہنم اُسے آوازیں دے دے کر بلاتی ہے جو سیدھے راستے سے منہ پھیر کر چل دیتا ہے یا اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ یعنی اُسے، جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر تھیلی کا منہ کس کر باندھ دیتا ہے کہ یہ مال کسی اور کے کام نہ آسکے۔

(۱۵) ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، استبداد ہے قرآن اس استبداد کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔

(۱۶) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی اس تقویٰ سے قریب تر ہے۔

(۱۷) جو کوئی الاسلام کے سوا کوئی اور نظامِ زندگی چاہتا ہے تو وہ نظام کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا اور وہ آخر الامر نقصان اٹھائے گا۔

(۱۸) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے خدا نے اس سب کو تمہارے فائدے کیلئے قانون کی زنجیروں سے مسخر کر رکھا ہے۔

طلوعِ اسلام کے پمفلٹ

طلوع اسلام کی طرف سے جو قرآنی فکر پیش کی جاتی ہے اسے سمجھنے کے لئے یوں تو اس کی طرف سے شائع کردہ سارے لٹریچر کا مطالعہ ضروری ہے لیکن اس کے پمفلٹس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک تو ہر پمفلٹ میں ایک ہی موضوع پر بات کی جاتی ہے۔ دوسرے اس کی قیمت بھی بہت کم ہوتی ہے۔ ذیل میں چند اہم پمفلٹوں کی فہرست دی جاتی ہے۔ انہیں آپ خود بھی پڑھیں اور دوسروں تک بھی پہنچائیں۔ ان کی قیمت ٹکٹوں میں یا بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں۔ محصول ڈاک ہم خود لگا دینگے لیکن اگر آپ انہیں بذریعہ رجسٹری منگانا چاہیں تو پچاس پیسے فیس رجسٹری بھی ارسال فرمائیں

---

(۱) قیامت موجود : مذہب اور دین میں بنیادی فرق کیا ہے۔ قیمت ۲۰/- پیسے

(۲) قانون کی حکمرانی : اسلام میں حکومت نہ کسی بادشاہ کی ہے نہ پارلیمان کی، نہ ڈکٹیٹر کی، نہ جمہوریت کی۔ اسمیں حقِ حکومت صرف قانونِ خداوندی کو حاصل ہے۔ قیمت ۲۵/- پیسے

(۳) مومن کسے کہتے ہیں : مومن ہونیکا دعویٰ تو ہر ایک کو ہے لیکن مومن کسے کہتے ہیں؟ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ دیکھئے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ قیمت ۳۷/- پیسے

(۴) پاکستان میں قانون سازی کا اصول : اسلامی حکومت میں قانون کس طرح بننا چاہیئے۔ بڑا اہم سوال ہے۔ قیمت ۲۰/- پیسے

(۵) معرکۂ دین و وطن : تحریکِ پاکستان سے کیا مقصود تھا۔ قائداعظمؒ نے یہ جنگ کس طرح لڑی ایک حقیقت کشا داستان۔ عبرت انگیز پس منظر۔ قیمت ۲۰/- پیسے

(۶) ہم عید کیوں مناتے ہیں؟ : آپ نے کبھی اس سوال پر غور نہیں کیا ہوگا۔ حالانکہ یہ سوال بڑا غور طلب ہے اور اسکا جواب بڑا بصیرت افروز۔ قیمت ۱۳/- پیسے

(۷) مقامِ محمدی : مقامِ نبوت کیا ہے؟ معراج نبویؐ سے کیا مراد ہے؟ سورۂ والنجم کی وجدآور تفسیر۔ قیمت ۲۵/- پیسے

(۸) سنتِ رسول اللہ : حضورؐ کی سنت کا صحیح مقام کیا ہے، منکرِ سنت کسے کہتے ہیں؟ قیمت ۲۵/- پیسے

(۹) پاکستان میں کوئی جو کانہ رہے: قرآن کا معاشی نظام یہ ہے کہ کوئی فرد روٹی، کپڑے، مکان علاج، تعلیم سے محروم نہ رہے۔ قیمت ۱۳/- پیسے

(۱۰) اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں: موضوع کی اہمیت اور تفصیل خود عنوان سے ظاہر ہے اس سے نظر آجاتا ہے کہ اسلامی مملکت کے سربراہ کی زندگی کیسی ہوتی ہے اور اس کی ذمہ داریاں کیا۔ قیمت ۲۵/- پیسے

(۱۱) کمیونزم اور اسلام: اسلام کے معاشی نظام اور روس اور چین کے اشتراکی نظام کا تقابل۔ (اشتراکیت + خدا = اسلام) کے فارمولے کی وضاحت۔ قیمت ۲۵/- پیسے

(۱۲) ایسا کیوں ہے؟ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارا حج، ہماری زکوٰۃ وہ نتائج کیوں نہیں پیدا کرتے جو نتائج اسلام کے قرن اول میں پیدا ہوتے تھے ۔ انداز بیان بیحد دلچسپ۔ قیمت ۱۰/- پیسے

ادارہ طلوع اسلام کی ایک حسین پیشکش

احباب کی طرف سے اکثر تقاضا ہوتا تھا کہ ایک ایسا ٹریکٹ مرتب کرنا چاہیئے جسے قوم کے دانشور طبقہ کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا جا سکے کہ اس سے آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ اسلام نے نوعِ انسان کو وہ کونسی چیز دی ہے جو اسے کہیں اور نہیں مل سکتی تھی۔ یہ کتابچہ ۔

"منشورِ آزادی"

کے نام سے پیش کیا جا چکا ہے۔ اوفسٹ کی بہترین چھپائی۔ امی ٹیشن آرٹ پیپر موزوں سائز۔ قیمت صرف ایک روپیہ

خورشید عالم

امریکہ کا عالمی کردار

تاریخ اور جغرافیہ کے عناصر ترکیب نے امریکہ کو جو مزاج اور کردار عطا کر دیا ہے، وہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ امریکہ کو آباد کرنے میں تین براعظموں نے حصہ لیا ہے۔ ایک خود امریکہ، دوسرا افریقہ اور تیسرا یورپ — امریکہ کے اصلی باشندوں کو یورپی آبادکاروں نے قریب قریب بے دخل کر دیا۔ امریکہ کی غالب آبادی ان یورپی آبادکاروں کی اولاد پر ہی مشتمل ہے۔ جنہوں نے نئی دنیا کی جنت میں گھر بنانے کے لئے اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ دیا۔ تارکین وطن کے یہ ریلے امریکہ کے مشرقی ساحل پر اترتے اور مرتے مارتے، مقامی باشندوں کو دھکیلتے، جنوب اور مغرب کی طرف بڑھتے گئے۔ نئی دنیا بسانے کے لئے ان آبادکاروں کو محنت مشقت اور خدمت کے لئے شودروں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ ضرورت ان کے اُن بھائی بندوں نے پوری کی، جو یورپ سے نکل کر افریقہ کی تاریکی میں ٹامک ٹوئیے مارنے لگے تھے۔ انہوں نے افریقہ کے حبشیوں کو غلام بنایا اور ان غلاموں کو امریکہ کی منڈی میں لے جا لے جا کے فروخت کیا۔ غلاموں کی یہ تجارت یورپ اور امریکہ کی تاریخ کا گھناؤنا باب ہے۔ غلاموں کی رسد اور فروخت کے سلسلے کی ہر کڑی ایسی ہے جس پر تہذیب اور انسانیت ہمیشہ ماتم کرتی رہے گی۔ امریکہ جب تک ان اثراتِ خبیثہ سے آزاد نہیں ہو جاتا، اخلاق و اقدار کی میزان میں اس کا کردار کچھ قیمت نہیں پا سکتا۔ غلاموں اور مقامی باشندوں سے جو مذموم سلوک اہل امریکہ نے روا رکھا اس سے ان کا مزاج بڑا مسموم ہو گیا۔

امریکی قوم کا تشخص جغرافیے کی دین ہے۔ دنیا کے دو بڑے سمندروں نے اسے یورپ، افریقہ، اور ایشیا تینوں براعظموں سے الگ تھلگ کر دیا ہے۔ اس علیحدگی اور دوری نے اہل امریکہ کو اپنے آباؤ اجداد سے جداگانہ اور نئی قوم بھی بنا دیا ہے اور اس میں علیحدہ اور دور رہنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا۔ امریکی بالعموم اپنے آپ میں ڈوبے رہے اور انہوں نے اس سے کوئی ایسا سروکار نہ رکھا کہ ان کے ہمسائے، نزدیک یا دور

کے، کیا کر رہے ہیں۔ ان کا انداز کچھ اس قسم کا رہا کہ وہ خود جو کچھ کر رہے ہیں اپنی جگہ ٹھیک کر رہے ہیں، نہ ہمسایوں کو ان کے معاملات میں مداخلت کرنی چاہیئے، نہ انہیں ہمسایوں سے کوئی مخاصمت ہونی چاہیئے۔ آج بھی امریکہ میں جا کے ایک عام امریکی کو دیکھا جائے تو اس کا انداز کچھ اس قسم کا ہوگا۔ اچھا آپ فلاں ملک کے رہنے والے ہیں۔ آپ کا مذہب فلاں ہے۔ آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ ہم تو یوں ہیں۔ شاید آپ کے نزدیک ہم غلطی پر ہوں۔ لیکن ہمارا تجربہ کچھ اسی قسم کا ہے۔ آپ ہمیں دیکھ کے خواہ مخواہ اپنا راستہ نہ بدلئے۔ ہمارے تجربے سے، البتہ آپ استفادہ کر سکتے ہیں تو ضرور کیجئے۔ ہم آپ سے نہیں اُلجھتے۔ آپ ہم سے نہ اُلجھئے کا مرنجاں مرنج اصول امریکی مزاج میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ "کسے را با کسے کارے نباشد" کے وہ عملاً اس حد تک قائل ہیں کہ ان کے ایک شہر کا اخبار دوسرے شہر کے اخبار کے لئے کم و بیش بیکار ہے۔ گنتی کے دو چار اخبار ہیں جو بین الاقوامی مزاج رکھتے ہیں۔ ورنہ سبھی اپنے اپنے شہر کے حالات و واقعات سے پُر ہوتے ہیں۔ اور وہیں تک محدود۔

گو اندرون امریکہ اس کا مظاہرہ نمایاں طور پر اب بھی ہو رہا ہے لیکن دو عالمگیر جنگوں نے امریکی قوم کو اپنے خول سے نکالنے کے لئے بڑا کام کیا۔ جنگِ عظیم اول یورپ سے شروع ہوئی اور امریکہ سے دور دور رہی۔ اس جنگ میں بظاہر امریکہ کے لئے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن بالآخر اسے اس آگ میں کودنا پڑا۔ لیکن جنگ کا خاتمہ ہوا تو امریکہ پھر سے سکڑ کر اپنے خول میں جانے لگا۔ وہ جمعیتِ اقوام تک میں شرکت سے محترز رہا۔ اس کا خول دوسری جنگ نے توڑا۔ اس جنگ میں بھی وہ آسانی سے شریک نہیں ہوا لیکن جب ہو گیا تو پھر اس نے واپسی کا نام نہیں لیا۔ دوسری جنگ کے دوران وہ عالمی طاقت ہی نہیں بن گیا تھا بلکہ عالمی قوتوں میں سرفہرست آگیا تھا۔ ایٹم بم جیسا لاجواب تباہ کن ہتھیار اس نے بنا بھی لیا تھا اور اسے استعمال بھی کر چکا تھا۔ اب اس کا سب سے بڑا حریف یعنے روس بھی اس کا مدِ مقابل نہیں تھا۔ یوں نظر آنے لگا کہ دنیا امریکہ کے قدموں میں ہے۔ دنیا کی نظریں خود بخود امریکہ کی طرف اٹھنے لگیں۔ چونکہ امریکہ اٹھارویں صدی میں برطانوی استعمار کے خلاف لڑ کے آزاد ہوا تھا اور آزادی پسند تھا۔ اس لئے آزادی کی طلب گار قومیں اس کی مثال سے سبق بھی سیکھتی تھیں اور اس سے اخلاقی تائید کی متمنی بھی ہوتی تھیں۔ یہ تائید انہیں ملتی تھی، اور اسے بڑا غنیمت سمجھا جاتا تھا کہ ایک سفید فام قوم سفید یورپی استعمار کے خلاف ہے۔ جنگ کے بعد آزادی کی رو پھیلی گئی اور ممالک محروسہ آزاد ہونے لگے۔ یہ نو آزاد ممالک جو غلامی سے گلو خلاصی کرانے کے لئے امریکہ کی اخلاقی امداد کے متمنی ہوا کرتے تھے، قومی تعمیر و ترقی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے امریکہ جیسی دولتمند اور صفِ اول کی ترقی یافتہ قوم سے مادی امداد کے طلب گار ہوئے۔ ان تقاضوں نے بین الاقوامی امداد و

تعاون کا تصور ہی نہیں ابھارا اسے عملاً متشکل بھی کیا۔ ممالک ایشیا و افریقہ کی امریکہ سے استمداد ایک حقیقت پسندانہ اقدام تھا۔ کیونکہ روس کے جنگ کی زد میں آجانے سے یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ عالمی طاقت ہونے کے باوجود ضرورت مند اقوام کی مدد کرنے کے قابل ہوگا یوں بھی روس اشتراکی اصول کے پیش نظر غیر اشتراکی ممالک کی مدد کو پہنچنے کا روادار نہیں تھا۔

اقوام متحدہ جیسے عالمی ادارے کے پس منظر میں بین الاقوامی امداد و تعاون کا یہ عمل بڑا امید افزا تھا۔ لیکن امداد کا تصور اصلاً مخلصانہ تھا یا مفاد پرستانہ وہ عملاً خود غرضانہ ہو کے رہ گیا۔ حالات کی رفتار کو اس میں خاصا دخل تھا۔ جونہی جنگ ختم ہوئی فاتح حلیف ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ روس ایک طرف ہو گیا اور مغربی اقوام برطانیہ، فرانس اور امریکہ دوسری طرف ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی مغربی قومیں ایشیا اور افریقہ سے بے دخل ہونے لگیں۔ خود امریکہ چین میں بری طرح پٹا اور بالآخر اسے چیانگ کائی شیک سمیت چین کو اشتراکیت کے سپرد کر کے جزیرہ فارموسا پر قناعت کرنا پڑی۔ امریکہ اس شکست کی خفت آج تک بھلا نہیں سکا۔ جنگ عظیم سے وہ یوں ابھرا تھا کہ اس کی ساری جیبیں ایٹم بم جیسے غیر معمولی طور تباہ کن ہتھیاروں سے بھری پڑی تھیں۔ یہ ہتھیار کسی اور قوم کے پاس نہیں تھے اس لئے طاقت میں کوئی اور قوم امریکہ کے ہم پلہ نہیں تھی۔ یہ طاقت چین میں دھری کی دھری رہ گئی اور امریکہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ چین کو اس کا مزہ چکھائے گا۔ لیکن اس کی حالت عجیب تھی۔ استعمار کا اسے کوئی ایسا تجربہ نہیں تھا۔ اس کے استعماری دوست یعنی ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ، جو دنیا بھر پر چھائے ہوئے تھے۔ پسپا ہو رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ایشیا اور افریقہ ان سے خالی ہو گئے اور کوئی اکا دکا کلنگ کے ٹیکے باقی رہ گئے ان حالات میں امریکہ نے دیکھا کہ ایشیا اور افریقہ میں اس کے پاس قدم جمانے کے لئے کوئی اہم جگہ نہیں رہی لیکن اس کے لئے دوہری مشکل پیدا ہو گئی کیوں کہ وہ یورپ سے ایسا الجھا ہوا تھا کہ یکسوئی سے ایشیا کی طرف توجہ نہیں دے سکتا تھا۔

یورپ لڑائی سے تباہ ہو گیا تھا اور اس کا مشرقی حصہ روس کے تصرف میں چلا گیا تھا۔ یہ خطرہ یقینی تھا کہ باقی یورپ میں روس کا اثر دخل بڑھ جائے گا۔ امریکہ نے روس کا راستہ روکنے کے لئے پورا زور لگایا اور خوب دولت صرف کی۔ شمالی اوقیانوس کے ممالک کا معاہدہ دفاع یعنے نیٹو اس سلسلے کی اہم ترین کڑی ہے۔ اس کی دوسری اہم کڑی "مارشل منصوبہ" تھا۔ اول الذکر فوجی تنظیم ہے اور آخر الذکر معاشی بحالی کا پروگرام تھا۔ امریکہ نے مغربی یورپ کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے روس کے خلاف بنیان مرصوص تیار کرنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امریکہ کی بے دریغ امداد کے بغیر یورپ جنگ کی

تباہ کاریوں سے بآسانی یا اتنے قلیل عرصے میں کبھی ابھر نہ سکتا لیکن امریکہ کی کامیابی ہیں سے ہی اسکی ناکامی اور پریشانی کی شکل نکلتی چلی آئی۔ یورپ میں امریکہ کا اس قدر تسلط بڑھ گیا کہ خود اس کے حلیف سٹپٹا اٹھے۔ خودداری کا بتدریج مظاہرہ فرانس کی طرف سے ہوا۔ وہ اپنے آپ میں آ گیا اور امریکہ کو اس کا احساس دلاتا گیا۔ کہ یورپ اس کا محروسہ یا مقبوضہ نہیں۔ نیز امریکہ یورپ کا دوست ہو سکتا ہے سربراہ نہیں۔ فرانس کی خود پسندی اور خود ارادی نے یورپی اتحاد اور صف بندی کا تصور اس حد تک بدل کے رکھ دیا ہے کہ نیٹو جیسی تنظیم کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ فرانس نے صاف طور پر اعلان کر دیا ہے کہ نیٹو کے جو اڈے اور سپاہی فرانس میں ہیں وہ فرانس کے حکم کے تابع ہونگے۔ اس طرح فرانس کی وہ اپنی افواج بھی فرانس ہی کے حکم کے تابع ہوں گی۔ جو اب نیٹو کی کمان میں فرانس سے باہر متعین ہیں۔

روس کے لئے یہ صورتِ حال اتنی ہی خوش آئند ہے جتنی امریکہ کے لئے پریشان کن۔ امریکہ کی پریشانی روس تک ہی محدود نہیں۔ اس نے نام نہاد دفاعی تنظیموں کا ایک عالمگیر سلسلہ روس کیخلاف متشکل کر رکھا تھا۔ اس نوعیت کے اور اس سے متعلق منصوبے تھے سنٹو اور سیٹو۔ سنٹو یعنی سابقہ معاہدہ بغداد میں ترکی شریک ہے جو نیٹو کا بھی رکن ہے۔ اسی طرح سیٹو میں پاکستان شامل ہے جو سنٹو کا رکن ہے اور فرانس اور برطانیہ بھی ہیں جو نیٹو میں شریک ہیں۔ امریکہ تو ان سب مسالوں میں پہلا مولہ کی طرح موجود ہے۔ یہ سارے اقدامات اشتراکیت کے خلاف تھے جس سے کبھی روس مراد لیا جاتا تھا، پھر روس اور چین اور اب زیادہ تر چین۔ ان منصوبوں کی اٹھان تو اپنی جگہ ٹھیک تھی لیکن ایک تو سنٹو اور سیٹو کو ویسی اہمیت کبھی حاصل نہ ہو سکی جو نیٹو کی تھی' دوسرے یہ غنچے کھلتے کھلتے مرجھا گئے۔ دونوں معاہدات عملاً بیکار ہیں اور قریباً سبھی شریک ممالک نے روس اور چین سے براہ راست تعلقات استوار کر لئے ہیں۔ گویا دفاعی یا عسکری صف بندی کا تصور اس حد تک بدل گیا ہے کہ امریکہ نے جو قلعے تعمیر کئے تھے وہ مٹی کے گھروندے بن کے رہ گئے ہیں۔ امریکہ کی کج فہمی اور مستقبل ناشناسی کی مثال بھارت کے علاوہ شاید ہی کوئی اور مہیا کر سکے۔

امریکہ یوں تو بین الاقوامی میدان میں کھل کر جنگِ عظیم کے دھماکے سے آیا لیکن برطانیہ نے بھی اسے گھسیٹ لانے میں بڑے جتن کئے۔ دو جنگوں میں برطانیہ کا بھلا اسی میں تھا کہ اسے امریکہ کا ساتھ میسر آ جاتا۔ چنانچہ اس کے لئے اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور اس کی مراد بر آئی۔ جنگ کے بعد بھی برطانیہ کا مفاد امریکی تعاون کا متقاضی رہا اور ہے۔ دوسری جنگ نے برطانیہ کو پہلے کی طرح صفِ اول کی طاقت نہیں رہنے دیا۔ اس کی سلطنت ختم ہو جانے سے اس کی عالمی حیثیت کو اور دھکا لگا۔ لیکن اس کی استعماری رسّی کا

بل جل جانے کے باوجود نہیں گیا۔ اس نے اپنا بل بھی برقرار رکھا اور امریکہ کی رسّی میں بھی ویسے ہی بل ڈال دیئے استعماری تجربہ امریکہ کو نہ تھا۔ اس کمی کو انگریز نے پورا کیا۔ شعلۂ استعمار کو بھڑکانے میں ان عناصر نے ایندھن کا کام دیا جو امریکہ کی مختصر سی تاریخ نے اس کی بنیاد میں پوشیدہ کر دیئے تھے۔ امریکہ میں آنے والے یورپی آبادکاروں کو مقامی باشندوں سے بھی واسطہ پڑا اور افریقی غلاموں سے بھی۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے؛ یہ ان کی قومی زندگی کا بڑا گھناؤنا پہلو ہے۔ مقامی باشندوں اور حبشی غلاموں کی اولاد آج امریکی ہی متصور ہوتی ہے۔ لیکن یورپی آبادکاروں نے ان سے جو انسانیت سوز سلوک روا رکھا، اس نے عالی اقدار کا احترام پنپنے نہیں دیا۔ نسلی برتری، امتیازِ رنگ اور اقدار فراموشی کے ملے جلے احساسات نے امریکہ کو استعماری کردار کے لئے خاص انتیار کر دیا۔ برطانیہ کی ضرورت مندانہ انگیخت نے ان احساسات کو ایسی ہوا دی کہ آزادی کی نیلم پری دیو استبداد بن کر کرۂ ارض پر پائے کوب ہو گئی۔ یہ دیو دنیا کے سارے سمندروں کے سینوں پر ناچ رہا ہے ــــ ناچے جا رہا ہے اور دنیا حیران ہے کہ اس کا بوس کا بالآخر کیا بنے گا۔

امریکہ کو سب سے زیادہ پریشان روس نے کیا۔ اب اسے روس کی طرف سے ایک حد تک اطمینان ہو گیا ہے۔ گو روس کی جگہ چین نے لے لی ہے اور امریکہ کی مصیبت جوں کی توں ہے۔ روس دوسری جنگ سے تباہ حال نکلا تھا۔ لیکن چند سالوں میں اس نے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے تباہی کے وہ سارے خوفناک سے خوفناک ہتھیار بنا لئے جو امریکہ نے بنا رکھے تھے۔ اس نے امریکہ کی اجارہ داری ہی ختم نہیں کی بلکہ اس پر سبقت بھی لے گیا۔ اب گو امریکہ کبھی کبھی تسلی سے یہ کہہ جاتا ہے کہ وہ دشمن کو نیست و نابود کر سکتا ہے لیکن وہ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ وہ پہل کر کے روس کا کچھ بھی حشر کرنے پر قادر کیوں نہ ہو، وہ روس کے ہاتھوں اسی طرح تباہ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ روس خلا میں امریکہ سے ہزار فرسنگ آگے ہے اور امریکہ اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ خلا کی دوڑ بھی کارِ زمین کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرانے کی ناقابلِ بیان اور ناقابلِ یقین حد تک خطرناک صورت ہے۔ روس کے یوں مدِ مقابل ہو جانے بلکہ سبقت لے جانے سے امریکہ روس سے متعلق اپنے رویئے پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ جب روس کو حریف سمجھنے میں نقصان ہے، فائدہ نہیں تو کیوں نہ اس سے دوستی پیدا کر لی جائے۔ روس سے تعلقات بہتر ہو جانے سے امریکہ یورپ سے بے فکر ہو سکتا ہے۔ اس کا یہ دردِ سر ختم یا کم ہو جائے تو وہ اپنے دشمن چین کی طرف اطمینان سے توجہ دے سکتا ہے۔ چین کی طرف توجہ دینے میں امریکہ اپنا بھلا بھی دیکھتا ہے اور روس کا بھی۔ روس اور چین میں نظریاتی کشیدگی بڑی شدت اختیار کر چکی ہے۔ اس کشیدگی نے یہ دوہرا سوال پیدا کر دیا ہے کہ اشتراکیت کا قائد یا سرچشمہ روس ہے یا چین۔ اور ایشیا روس کے دائرۂ اثر میں ہے یا چین کے۔ امریکہ دونوں امور میں روس کا ساتھ دینا چاہتا

ہے۔ ایسا کرنے میں اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ روس کا خطرہ امریکہ سے ٹل جاتا ہے اور اس کا رُخ چین کی طرف مڑ سکتا ہے۔

امریکہ کا رُخ ایشیا کی طرف موڑنے کا باعث بہت حد تک چین خود بھی ہے۔ اس کی اشتراکی قیادت نے امریکہ کو چین سے بے دخل کیا۔ پھر پہلے روس کی مدد سے، اور بعد میں روس کی مدد کے باوجود بلکہ مخالفت کے علی الرغم، اس نے ایسی ترقی کرلی ہے کہ وہ عالمی طاقت بن گیا ہے۔ امریکہ یہ بالکل گوارا نہیں کر سکتا، اور وہ ہر جتن کرکے چین کا راستہ روکنا چاہتا ہے۔ اس کے راستے کٹھن ہیں مگر وہ اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے۔ امریکہ کا استعمار نئے روپ میں ظاہر ہوا ہے۔ آئینے کے ایک ٹکڑے میں پورے تاج محل کا عکس دیکھ کر وہ مصر ہے کہ تاج محل وہ عظیم الشان عمارت نہیں بلکہ آئینے کا حقیر ٹکڑہ ہے۔ وسیع و عریض چین، جس کی آبادی اس کی اپنی آبادی کا ساڑھے تین گنا ہے، امریکہ کے نزدیک چین نہیں، وہ فارموسا جزیرے کو چین کہلانے پر تلا ہوا ہے۔ اس جزیرے کے شکست خوردہ نمائندے کو دنیا کی قومیں تسلیم کرلیں یا بھی اپنی کسرِ شان سمجھیں لیکن اسے اقوامِ متحدہ میں مستقل رکنیت کا قابلِ رشک مقام حاصل ہے۔ یہی نمائندہ سلامتی کونسل میں روس، امریکہ، فرانس اور برطانیہ کا ہم پلّہ ہے اور استرداد کا حق رکھتا ہے۔ فارموسا کے غبارے کو پھلا پھلا کر چین کے برابر کرنے کے لئے امریکہ نے اپنا ساتواں جنگی بیڑہ جنوبی چینی سمندر میں متعین کر رکھا ہے۔ خلیج فارس اور بحیرہ قلزم سے بحرالکاہل تک کے خلا کو پُر کرنے کے لئے اس نے اپنا چھٹا بیڑہ سمندر میں پھیلا دیا ہے۔ بحیرہ روم میں اس کا آٹھواں بیڑہ موجود ہے۔ بحر اوقیانوس میں اس کی کمان میں نیٹو کارفرما ہے۔ بحرالکاہل میں اس کے جگہ جگہ اڈے موجود ہیں۔ یہ عالمگیر نام نہاد دفاعی تیاریاں ساری کی ساری چین کے خلاف ہیں چین سے بے دخل ہوکے امریکہ کے پندار کا صنم کدہ کچھ ایسا ویران ہوا ہے کہ وہ اب تک طوافِ کوئے ملامت سے باز نہیں آسکا۔

اس طواف کا راستہ اس نے کوریا کے ذریعے تلاش کیا اور اقوامِ متحدہ کے نام پر لاؤ لشکر لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس جنگ کی طرح ڈالنے کا امریکہ کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ یہ طویل اور بے مقصد جنگ شروع بھی ہوئی اور جاری بھی رہی۔ یہ تو غنیمت ہے کہ کوریا عالمی یا ایٹمی جنگ کی تمہید نہیں بن سکا۔ لیکن اس سے عالمی کشیدگی میں اضافہ ضرور ہوا۔ کوریائی جنگ کا شور مشکل تھا کہ فرانس سابقہ ہند چینی میں شکست کھا کر پسپا ہوگیا۔ ۱۹۵۴ء کی جینیوا کانفرنس میں اس مسئلے کا جو متفقہ حل وضع کرلیا گیا تھا، امریکہ نے آہستہ آہستہ اسے ناکام بنا دیا۔ ویٹ نام اور اس کے گرد و نواح میں امریکہ کو چین ہی چین دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ وہاں چین کا ایک بھی سپاہی نہیں۔ اس کے برعکس جگہ جگہ امریکہ کے اپنے فوجی اڈے قائم

ہیں۔ صرف ویٹ نام میں اس وقت امریکہ کے کوئی سوا دو لاکھ مسلح فوجی ہیں۔ آخر یہ کس لئے؟ ویٹ نام کا مسئلہ ہے کیا؟ بات صرف اس قدر ہے کہ اس کے اندر ایک ترقی پسند یا انقلابی تحریک اُبھری۔ وہ اشتراکی تھی یا اسے اشتراکی کہہ دیا گیا۔ یہ تحریک اپنے ملک کی تشکیلِ نو کرنا چاہتی ہے۔ ہزاروں میل دور بیٹھا امریکہ یہ نہیں چاہتا کہ ویٹ نام میں برسرِ اقتدار وہ طبقہ آئے جو نظریئے کے اعتبار سے اشتراکی ہے یا جسے امریکہ اشتراکی سمجھتا ہے۔ امریکہ کو یہ تو حق پہنچ سکتا ہے کہ وہ ویٹ نام یا کسی اور ملک کا اشتراکی ہونا پسند نہ کرے لیکن یہ حق اسے کسی طور نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اپنا لاؤ لشکر لے کر وہاں پہنچ جائے اور اس گروہ کے خلاف لڑنا شروع کر دے جو ایک طرح کے انقلاب کا داعی ہے۔ ویٹ نام امریکہ کا مقبوضہ نہیں بلکہ آزاد ملک ہے۔ امریکہ نے اس ملک کی آزادی کو بالائے طاق رکھ کر اپنی فوجیں وہاں بھیجنا شروع کر دیں۔ اور بدستور بھیجے چلا جا رہا ہے گویا امریکہ یہ نہیں کر رہا کہ حکومتِ وقت کو اشتراکی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے مدد دے بلکہ وہ خود اس ملک کے اندر اپنے طور پر لڑ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں چین اور روس کا یہ حال ہے کہ وہ اشتراکی تحریک کو اخلاقی مدد بھی دے رہے ہیں اور مادی بھی۔ روس بالخصوص شمالی ویٹ نام کی حکومت کو مدد دے رہا ہے لیکن وہ امریکہ کی طرح اس پر قبضہ کر کے خود نہیں لڑ رہا۔ امریکہ کی جنگ کے باوجود، بلکہ اس کی وجہ سے حال یہ ہے کہ ویٹ نام دو حصوں میں بٹ چکا ہے۔ اس کا شمالی حصہ آزاد اور اشتراکی ہے۔ جنوبی ویٹ نام میں جسے امریکہ نے جنگی چھاؤنی بنا رکھا ہے، ویٹ کانگ یعنی حریت پسند اسّی فیصد حصے پر قابض ہیں۔ امریکہ خود تسلیم کرتا ہے اور اس کا اعلانیہ اعتراف کر چکا ہے کہ وہ ویٹ نام کی جنگ جیت نہیں سکتا۔ وہ جیت کیسے سکتا ہے، ویٹ نامی تو اس کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے خلاف ہیں۔ اشتراکیت ان کے حق میں مفید ہے یا نہیں، وہ اسے جنگِ حریت کہتے ہیں اور امریکہ کو اپنے ملک سے نکال دینے کے لئے ایسی قربانیاں دے رہے ہیں جس نے ایک عالم کو دنگ کر دیا ہے۔

جب صورت یہ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ویٹ نام کو اپنا مسئلہ خود کیوں نہ حل کرنے دیا جائے۔ اسے اپنے حال پر چھوڑنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ۱۹۵۴ء کے معاہدہ جنیوا میں یہ طے ہو گیا تھا کہ ویٹ نام میں ویٹ کانگ کو کیا درجہ ملے گا۔ انتخابات کیسے ہوں گے اور متحدہ ویٹ نام کی ایک حکومت کیسے معرضِ وجود میں آئے گی۔ اس معاہدے میں شریک ہونے کے باوجود امریکہ اس پر عمل درآمد نہیں ہونے دے رہا۔ وہ طاقت کے زور پر ویٹ نام کو غیر اشتراکی بنانا چاہتا ہے۔ وہ شمالی ویٹ نام پر زور زور سے حملے کرتا ہے اور اُسے کہتا ہے کہ میرے ساتھ صلح کی بات کرو میں حملے بند کر دوں گا۔ شمالی ویٹ نام اسے بجا طور پر کہتا ہے کہ ہمارے ملک میں تمہارا کیا کام ــــ اپنی فوجیں ہٹاؤ اور معاہدہ جنیوا پر عمل ہونے دو اور بات

کرنی ہے تو ویٹ کانگ (تحریکِ حریت) سے کرو۔ امریکہ کی ویٹ نام میں اپنی حیثیت کچھ نہیں۔ اسے وہاں موجود ہونے کا کوئی حق نہیں لیکن وہ کہہ یہ رہا ہے کہ وہ ویٹ کانگ کو تسلیم نہیں کرتا — اور وہ لڑا اس کے خلاف رہا ہے اور پیٹ اس سے رہا ہے! امریکہ کا موقف تسلیم کر لیا جائے تو جس طرح وہ ویٹ نام میں فوجیں بھیج رہا ہے، اس طرح وہ کسی ملک میں کسی وقت داخل ہو سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ جب تک یوں نہیں کرو گے یا یوں کرو گے میں تمہارے ملک میں تمہارے خلاف لڑوں گا۔ یہ بڑا سنگین بین الاقوامی مسئلہ ہے، اور پیدا اس لئے ہو گیا ہے کہ امریکہ خوفناک جنگی طاقت بن گیا ہے۔ چین اور روس کا رویہ بالکل امریکہ کے الٹ ہے۔ وہ حکومتوں کی مدد کرتے ہیں اس لئے جس ملک کی وہ مدد کرتے ہیں اس کی ہمدردیاں حاصل کر لیتے ہیں۔ بلکہ وہ مدد نہ بھی کریں تو امریکہ کا رویہ اتنا اشتعال انگیز اور قومی خودی کے منافی ہے۔ کہ وہ جس ملک کا رُخ کرتا ہے وہاں کی رائے عامہ اس کے خلاف ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو سہارے وہ ملک کے اندر ازرہ بے خردی قائم کرتا ہے وہ کرم خوردہ لاٹھی کی طرح جواب دیتے جاتے ہیں۔ کوریا میں اسے کوئی مستحکم اور معتمد حکومت میسر نہیں آسکی۔ ڈاکٹر سنگ مین ری نے امریکہ کا ساتھ دیا تو وہ اپنی ساکھ بھی کھو بیٹھے اور ملک سے جلا وطن ہونا پڑا۔ چین میں چیانگ کائی شیک جیسا سرکردہ سربراہ حکومت امریکہ کی پشت پناہی کی بنا پر بے وقار و بے آبرو ہو کر چین سے بھاگ نکلنے پر مجبور ہوا۔ ویٹ نام میں حکومتیں ریت کی گھروندوں کی طرح بنتی اور بگڑتی ہیں۔ امریکی سنگینوں کے سہارے بے جان لاشے کھڑے ہوتے ہیں، اور انہیں کے زور سے گرتے ہیں۔

ان تجربوں سے امریکہ نے جو سبق سیکھا ہے وہ تجربوں سے زیادہ غلط ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے۔ کہ اسے ایسا ملک چاہیئے جہاں کی حکومت مستحکم ہو اور چین کے خلاف ہو تاکہ وہ چین پر کاری ضرب لگا سکے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ چین کو شکست دیئے بغیر فوجی قوت سے اس حد تک جھکا سکتا ہے کہ اس کا اثر و رسوخ ختم ہو جائے اور ایشیا میں امریکہ کا راستہ صاف ہو جائے۔ ایسا ملک اسے بھارت کی شکل میں دکھائی دے رہا ہے۔ وہ شروع ہی سے اس کے لئے کوشاں رہا ہے کہ بھارت میں اسے قدم جمانے کا موقع مل جائے۔ تاکہ چینی قضیے کا حتمی فیصلہ ہو جائے۔ اس نے کوئی پندرہ سال پہلے اس ملک سے ایک معاہدہ کیا جو بالکل خفیہ تو نہیں تھا لیکن اس کی پردہ پوشی ضرور کی گئی۔ یہ معاہدہ فوجی امداد کا تھا۔ براہ راست امریکی امداد کے علاوہ بھارت کو دوسرے ذرائع سے بھی امداد بہم پہنچائی جاتی رہی۔ گیارہ سال کی محنت کے بعد امریکہ کی کوششیں رنگ لائیں اور بھارت نے چین سے جنگ کی طرح ڈال دی۔ اس تصادم کا آغاز ہوا ہی تھا کہ امریکہ یوں بھارت میں آن موجود ہوا جیسے بھارت اس کا اپنا علاقہ ہے اور چین اس کے خلاف لڑ رہا ہے۔

بھارت میں ہر طرح کا جنگی سامان بے دریغ پہنچایا جانے لگا۔ اور بھارت کو امریکہ کے عالمی جنگی اڈوں سے اس طرح ملا دیا گیا کہ ضرورت پڑے تو منٹوں میں دنیا کے کونے کونے سے اُسے ہر طرح کی امداد پہنچائی جا سکے۔ امریکہ کے عزائم کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے بھارت سے ایک طاقت ور ٹرانسمیٹر کلکتہ میں نصب کرنے کا معاہدہ کیا اور اس کی قیمت یہ طلب کی کہ اس کے ذریعے امریکہ ہر روز ایشیا میں اپنا پروپیگنڈا نشر کیا کرے گا۔ اس معاہدے پر عمل اس لئے نہ ہو سکا کہ اندرون و بیرون بھارت اسکی مخالفت بڑی شدت اختیار کر گئی۔

بھارت کے ذریعے چین پر کاری ضرب لگانے کے لئے امریکہ کو بادی النظر میں بعض ایسے فوائد دکھائی دیتے ہیں جو اسے دوسرے ممالک میں حاصل نہیں تھے۔ لیکن نتائج اسکے برعکس نکلیں گے۔ اول تو یوں بھی بھارت میں امریکہ کو دیر ہی تک اٹھانی پڑے گی کیونکہ اس کی روش اصلاً غلط ہے۔ لیکن بھارت میں اسے ایک ایسے عنصر سے سابقہ پڑا ہے جس کا اسے پہلے موقعہ نہیں ملا تھا۔ یہ عنصر امریکہ کو اور خراب کرے گا۔ امریکہ یا تو اسے بھانپ نہیں سکا۔ یا جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر رہا ہے کہ بھارت ایک عیار ملک ہے۔ مکاری اس کی برہمنی ذہنیت میں ہزاروں سالوں سے رچی بسی ہے۔ برہمن کو آزادی نہیں برہمنی مفاد کا تحفظ چاہیئے۔ اور یہ تحفظ اس نے ہمیشہ دوسروں سے کرایا ہے، خود نہیں کیا۔ آج کا بھارت سیاسی آزادی کا نہیں مکاری کی آزادی کا خواہاں ہے۔ یہ مقصد اسے امریکہ کے عالمی اڈوں سے مربوط ہو کے حاصل ہو سکتا ہے، تو اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ البتہ وہ ایسا کرے گا اور اسے ملنے گا نہیں اور اس کے خلاف ہزار باتیں بنائے گا۔ بھارت نے امریکہ کی کمزور رگ دیکھ لی ہے۔ وہ چین کا نام لے کر اور اس کا ہوا کھڑا کر کے امریکہ کو مجبور کئے رکھے گا کہ وہ اُسے ہر طرح کی امداد بے دریغ سے پہنچاتا رہے۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ روس امریکہ کی دیکھا دیکھی ہر طرح کی مدد بہم پہنچائے گا۔ بھارت یہ سمجھتا ہے کہ روس اور امریکہ میں امداد کا مقابلہ پیدا کر کے وہ زبردست فوجی طاقت بن جائے گا۔ اور اس کے ہمسائے اس کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ امریکہ کو بھارت کی "ہندو پادشاہی" پر کوئی اعتراض نہیں۔ کیوں کہ اس طرح بھارت اس کے اثر میں ہی نہیں رہتا بلکہ اس کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ بھارت اپنی جگہ سمجھتا ہے کہ امریکہ اس کا آلۂ کار ہے۔ کون کس کا آلۂ کار ہے اس کا فیصلہ مشکل نہیں، لیکن اس سے امریکہ کے راستے میں اور مشکلات پیدا ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ بھارت کے ہمسائے امریکی عزائم سے متوحش تو تھے ہی، وہ بھارتی عزائم کو برائی العین دیکھنے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان امریکہ سے بددل ہو کر روس اور چین سے تعلقات استوار کر رہا ہے۔ اور اس کی دیکھا دیکھی ایران اور ترکی جیسے ممالک بھی اپنے رویئے پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ امریکہ نے

اپنی نالائقی سے اپنے دوستوں کو اپنے خلاف کر لیا ہے اور کئے چلا جا رہا ہے۔ اس کی سوچ غلط ہے تو عمل غلط تر۔ زمانے کا مزاج اس سرعت سے بدل رہا ہے کہ طاقت کے زور سے ضمیر انسانیت کو زیادہ دیر تک دبائے نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن یہ حسن ظن امریکہ سے بے سود ہے کہ وہ یہ راز سمجھ جائے گا اور بین الاقوامی میدان میں مثبت کردار ادا کرے گا۔ چین کے سانپ کی لکیر پیٹ پیٹ کر نہ اس کی لاٹھی کارآمد رہے گی، نہ اُسے سانپ تک ہی دسترس حاصل ہوگی۔ البتہ وہ خود امن عالم کے باغ میں سانپ بننے لگے گا۔

(اور یہ حشر ہر اس قوم کا ہونا ہے جس کے سامنے انسانیت کی مستقل اقدار نہ ہوں۔)
(طلوع اسلام)

قرآنی ذوق رکھنے والے احباب سے درخواست

جیسا کہ احباب کو معلوم ہے، میں آجکل تبویب القرآن کی ترتیب میں مصروف ہوں۔ تبویب القرآن کے معنے یہ ہیں کہ آپ کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہو۔ زندگی کا کوئی معاملہ سامنے آئے ـــ قرآن کریم نے اس کے متعلق کیا کہا ہے، اور کہاں کہا ہے۔ یہ سب کچھ ایک جگہ آپ کو مل جائے اور پھر آپ قرآن کریم کے ان مقامات کے مطالعہ سے دیکھ لیں کہ اس نے اس مسئلہ یا معاملہ کے متعلق کیا کہا ہے اور اس باب میں اس کی تعلیم یا راہنمائی کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی تبویب کا کام جہاں بےحد اہم ہے وہاں بہت وسیع بھی ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں سینکڑوں عنوانات اپنے سامنے رکھ لئے ہیں لیکن چاہتا یہ ہوں کہ یہ کتاب امکانی حد تک مکمل ہو اور زندگی کا کوئی سوال ایسا نہ رہ جائے جو اس کے اندر نہ آ جائے۔ اس مقصد کیلئے میں ان احباب کا تعاون چاہتا ہوں جو قرآن کریم کا ذوق رکھتے ہیں۔ ان سے میری درخواست یہ ہے کہ وہ ایسے عنوانات کی فہرست مجھے بھیج دیں جن کے متعلق وہ سمجھتے ہوں کہ قرآن کی راہنمائی کا سامنے آنا ضروری ہے۔ میں احباب کی ان فہرستوں سے ضروری عنوانات چن کر ان کا اپنی فہرست میں اضافہ کر لونگا اور اسطرح یہ فہرست زیادہ سے زیادہ حد تک مکمل ہو جائے گی۔ اس کے لئے میں احباب کا شکر گذار ہوں گا۔

اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ یہ کام بڑا وسیع ہے اسلئے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب تک مکمل ہو سکے گا۔ میں بہر حال اپنی دیگر مصروفیات کیساتھ اسے مسلسل وقت دیئے جا رہا ہوں وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم لیکن جتنا کچھ میں کر چکا ہوں اس سے میرا یہ اندازہ یقین میں بدلتا جا رہا ہے کہ اگر یہ مہم تکمیل تک پہنچ گئی تو میری لغات القرآن ـــ اور مفہوم القرآن کیساتھ یہ کڑی "قرآن کریم کے سمجھنے" کے، اسے بہت آسان کر دیگی۔

والسلام۔ پرویز

عصرِ حاضر کا بدنصیب انسان

عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں ـــ ان وحشیانہ قوتوں کے مقابلہ میں جن پر وہ اپنے دور کی معاشی اور سیاسی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی دنیا کی حالت اور اگر وہ اس اندھی دنیا سے، جہاں تخریب و تعمیر کی قوتیں ہر وقت ترازو کے پلڑوں کو اٹھاتی جھکاتی رہتی ہیں، اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتا ہے، تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

یہ الفاظ ڈاکٹر ینگ کے ہیں جس کا شمار ہمارے زمانے کے بلند ترین ماہر نفسیات میں ہوتا ہے اس نے اپنی تمام عمر نفسیاتی تجزیہ میں گزاری اور ہزاروں نوجوانوں کی تحلیل نفسی (PSYCHO-ANALYSIS) کے بعد ان کے اعصابی امراض کی تشخیص کرتا رہا۔ وہ اپنی مدت العمر کے تجربہ کے بعد، عصرِ حاضر کے انسان کے متعلق، جس نتیجہ پر پہنچا، اسے اس نے اپنی مشہور کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں بیان کیا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس اسی کتاب کا ہے جسے ہم نے، پرویز صاحب کی مایہ ناز تصنیف "انسان نے کیا سوچا" سے اخذ کر کے زیبِ عنوان کیا ہے یہ حقیقت ہے کہ انسان نے فطرت کی قوتوں کی تسخیر جس وسعت اور شدت سے اس دور میں کی ہے اس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان خود اپنے ہاتھوں، جس جہنم کے عذاب میں آج مبتلا ہے، اس سے پہلے اس کی شعلہ انگیزیاں نہ اس قدر عالمگیر تھیں، نہ ایسی انسانیت سوز۔ مادی آسائشوں کو دیکھئے تو وہ جس فراوانی سے آج حاصل ہیں ان کا تصور بھی اس سے پہلے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آج حالت یہ ہے کہ جس سے

بات کیجئے وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ اٹھتا ہے کہ ــــ

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ــــ انسانی زندگی کے اسی عدم سکون اور فقدان اطمینان کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے سائنسدان بڑے بڑے فلاسفر، بڑے بڑے مدبر، آخری عمر میں زندگی سے فرار اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے فریب نفس کیلئے اس شکست و فرار (ESCAPEISM) کا کوئی نہ کوئی حسین نام رکھ لیتے ہیں۔ یہ فرار وہی ہے جسے قدیم اصطلاح میں تصوف (MYSTICISM) کہا جاتا تھا۔ عصر حاضر کا بلند ترین عالم طبیعات ایڈنگٹن اپنی آخری عمر میں "سائنس اور عالم نامشہود" (SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD) کی تصنیف میں جذب دکھائی دیتا ہے۔ برگسان جیسا فلاسفر اپنی آخری تصنیف میں مذہب اور اخلاق کے دو ماخذ قرار دیتا ہے ــ ایک "شریعت" اور دوسرا "طریقت" ــ اوسپنسکی جیسا ریاضی دان، ہمالیہ کے جنگلوں میں سرگرداں دکھائی دیتا ہے۔ ہالڈین جیسا علم الحیات کا ماہر، بنارس کے سادھوؤں کے مٹھ میں جان دیدیتا ہے۔ انہی راہِ فرار اختیار کرنے والوں میں آلڈوس ہکسلے تھا جس کے فکر انگیز ناولوں نے فضا میں تحرک پیدا کر دیا تھا لیکن وہ، آخر العمر، میکسیکو کے جنگلات میں، وحشی قبائل کے ہاں جاکر ڈیرا جما لیتا ہے۔ وہ لوگ بھنگ جیسی کوئی بوٹی پیتے تھے جس کے نشے سے بدمست ہو کر، گاتے، بجاتے، چیختے، چلاتے، اور بالآخر مدہوش ہو جاتے تھے۔ ہکسلے صاحب بھی اسی کے رسیا ہو جاتے ہیں۔ اور اس "جنون میں جو کچھ بکتے ہیں" اسے ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کراتے رہتے ہیں اور اس کے بعد دعویٰ کرتے ہیں کہ میں نے اب زندگی کا راز پا لیا ہے۔ انکشافِ حقیقت کا راز برگِ حشیش میں ہے۔ وہ بھنگ کے اسی نشے کو فلسفۂ حیات قرار دیتے ہیں اور اس فلسفہ کو اپنی تصنیف (THE DOORS OF PERCEPTION) میں دنیا کو دے کر، خود عالم بالا کی طرف تشریف لے جاتے ہیں۔ خود تشریف لے جاتے ہیں لیکن اپنے نقوشِ قدم پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ اب انہی نقوشِ قدم پر امریکہ کے ایک اور پروفیسر چلتے ہیں جن کا اسم گرامی (LEARY) ہے۔ انہوں نے ایک اور بوٹی دریافت کی ہے جس کے مرکب کا مختصر نام (L.S.D) ہے۔ امریکہ کے نوجوان اس کے والہ و فریفتہ ہو رہے ہیں۔ کسی "تاریک" ملک میں یہ کچھ ہوتا تو اسے "چنڈوخانہ" سے تعبیر کیا جاتا، لیکن چونکہ یہ رَو، ایک مہذب ملک میں چل پڑی ہے اور اس کے چلانے والے ایک پروفیسر ہیں، اس لئے اسے وہاں ایک "جدید مذہب" اور نیا (CULT) کہہ کر عام کیا جا رہا ہے۔ وہاں کی یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے پروفیسر، مصنف، شاعر، اس

کے سرپرست ہیں۔ اور جب اس قسم کے علم و بصیرت کے حامل اس کے سرپرست ہوں تو اسٹوڈنٹس میں مذہب عام کیوں نہ ہو! ــــ اس مذہب کے بانی ــــ لیری ــــ پہلے امریکہ کے علم و تحقیق کے مرکز ہارورڈ میں تھے۔ وہاں سے نکالے گئے تو اب انہوں نے اپنا الگ ادارہ قائم کر لیا ہے۔ یہ قریب چار ہزار ایکڑ رقبہ پر مشتمل "خانقاہ" ہے۔ جس کے اردگرد کے جنگلات میں کتے اور بلے آوارہ پھرتے ہیں۔ اِدھر اُدھر بچے گھومتے ہیں۔ یہاں وہاں فقیروں اور ملنگوں کے مجسمے نصب ہیں۔ "خانقاہ" کے اندر، انداز زیست بدھ بھکشوؤں کا سا ہے۔ بڑے بڑے کمروں میں، میزیں ہیں جن کی ٹانگیں ندارد۔ گدے ہیں جو پلنگوں کے بجائے زمین پر بچھا رکھے ہیں۔ دور دور کے عقیدت مند، یہاں آتے اور کئی کئی دن گذارتے ہیں (L.S.D.) پیتے ہیں اور عالمِ لاہوت کی خبریں لاتے ہیں (یہ "تفاصیل" امریکہ سے شائع ہونے والے رسالہ نیوز ویک کی ۹ مئی کی اشاعت میں منظر عام پر آئی ہیں)۔ اس "مذہب" کو بڑی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اور اس کے معتقدین کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ملک کے نوجوان (بالخصوص طالب علم) اس میں ایک نئی زندگی کی لذت پاتے ہیں۔

یہ ہے دنیا کے مہذب ترین ملک کے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی حالت! اس وقت دنیا کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ــــ ایک مذہب پرست طبقہ (جسے عام الفاظ میں "مشرق" سے تعبیر کیا گیا ہے۔) دوسرا مادہ پرست طبقہ (جسے "مغرب" کہہ کر پکارا جاتا ہے) مذہب پرست طبقہ عوام کو کھلونے دے کر بہلاتا اور افسانوی افیون کھلا کر سلاتا رہتا ہے ــــ ان بیچاروں کو زندگی کی حقیقی مسرت تو ایک طرف، عام مادی آسائشیں بھی نصیب نہیں ہوتیں۔ "مغرب" میں مادی آسائشیں میسر ہیں لیکن وہاں کے نظریہ حیات کا نتیجہ کرب و اضطراب کے سوا کچھ ہو نہیں سکتا، جس سے نجات، یا تصوف کی افیون میں تلاش کی جاتی ہے یا ھکسلے اور لیری کی بھنگ میں ــــ تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں ــــ ہم سمجھتے ہیں کہ قلب انسانی کا عدم سکون اب اس بحران (CRISIS) کے مقام تک پہنچ چکا ہے جہاں، ہیگل نے کہا تھا کہ (THESIS) ــــ مروجہ تصور حیات ــــ کی جگہ (ANTI-THESIS) ــــ اس کی ضد نظریہ زندگی ــــ ابھرا کرتا ہے۔ اس بحران کو اقبالؔ نے ان الفاظ میں تعبیر کیا تھا کہ ؎

مغرب ز تو بیگانہ ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر اندازی

یہ "نقشِ دگر" یہ ہیگل کا (ANTI-THESIS)، وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے

سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؛ زندگی کے سفر (نہیں بلکہ آوارگی) کے تھکے ہارے انسان کو اس شجرِ راہ کے علاوہ اور کہیں سایہ نہیں مل سکے گا۔ اسے اس طرف آنا ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس شجرِ طوبےٰ کی آبیاری کی سعادت کس خطۂ زمین کے حصہ میں آتی ہے !

اقبالؔ نے اس "نقشِ دگر" کے قرطاس کے لئے پاکستان کا تصور دیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس خطۂ زمین میں بیٹھے ہوئے اس کے تصور کا یہ حشر ہوگا ! یہاں مشرق کی "افسانگی" اور مغرب کی "بیگانگی" دونوں انتہائی شدت پر ہیں۔ اس نے آج سے تیس سال پہلے، مسلمان کے متعلق کہا تھا کہ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

وہ اگر اس "کشتہ" کی حالت کو اب دیکھتا تو نہ معلوم کیا کہتا !

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

۱۔ لاہور :۔ ۲۵ ۔ بی ۔ گلبرگ ۲
ہر اتوار کی صبح ۸ بجے ۔

۲۔ راولپنڈی :۔ ہر جمعہ کی شب ۔ ۵ بجے ۔
الکوثر بلڈنگ ۔ بالمقابل گورنمنٹ زنانہ کالج مری روڈ ۔

۳۔ لائلپور :۔ پنجاب ٹریڈرز (۸۔۴) پیپلز کالونی ۔
ہر جمعہ کی شب ۔ بعد نماز عشاء ۔

۴۔ لیّہ :۔ نقل ہوٹل ۔ نزد ریلوے اسٹیشن ۔ ہر جمعہ

۵۔ ملتان :۔ میسرز شاہ محمد اینڈ سنز ۔
بیرون پاک دروازہ ۔ ہر جمعہ ۔

علاوہ ازیں یہ درس سرگودہا اور سیدن میں بھی ہوتا ہے مقام اور وقت کے متعلق مقامی بزم کے نمائندے سے دریافت فرمائیے ۔

انگلستان میں درس، بزم طلوعِ اسلام ۔ بریڈفورڈ کے زیرِ اہتمام نشر ہوتا ہے

طلوعِ اسلام کی شائع کردہ کتابیں ذیل کے پتہ سے بھی مل سکتی ہیں

(۱) کلاسیک بک سیلرز ۔ ۴۲ دی مال ۔ لاہور

(۲) انٹرنیشنل بک سروس ۔ ۷۵ دی مال ۔ لاہور

(۳) گوشۂ ادب ۔ چوک انارکلی ۔ لاہور

(۴) لاہور بک ڈپو ۔ ۶۵ دی مال ۔ لاہور

(۵) بک سنٹر ۔ چوک ریگل دی مال ۔ لاہور

(۶) آئیڈیل بک ہاؤس ۔ ۱۹۴ ۔ انارکلی ۔ لاہور

(۷) شریف سنز بک سیلرز ۔ کارخانہ بازار ۔ لائلپور

★

زکوٰۃ

(قرآن کریم کی روشنی میں)

آجکل پاکستان میں یہ بحث چلی ہوئی ہے کہ زکوٰۃ کیا ہے۔ اس کا نصاب اور شرح کیا ہے۔ اور مصارف کیا۔ کیا ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہم اس موضوع پر متعدد بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں، لیکن اس بحث کے چل نکلنے پر، ہمارے پاس استفسارات آنے شروع ہو گئے ہیں اور تقاضا کیا جا رہا ہے کہ ہم بتائیں کہ قرآن کریم کی رو سے اس کی پوزیشن کیا ہے — اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے، زکوٰۃ کے متعلق مروجہ مسلک کو سمجھ لیا جائے جسے ہمارا اقدامت پرست طبقہ پیش کرتا ہے۔ ان کے مسلک کے مطابق، جب کسی شخص کے پاس ایک خاص مقدار کے مطابق مال جمع ہو۔ اور اس پر ایک سال گذر جائے۔ تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک خاص حصہ خدا کی راہ میں دیدے۔ مال کی اس مقدار کو جس پر ان کے مسلک کے مطابق، زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، نصاب کہتے ہیں۔ جس نسبت سے اس میں سے زکوٰۃ نکالی جائے اسے شرح کہا جاتا ہے۔ عام طور پر نصاب حسب ذیل بتایا جاتا ہے۔

(۱)	چاندی	۵۲½	تولہ
(۲)	سونا	۷½	تولہ
(۳)	اونٹ	(۵)	پانچ
(۴)	گائے		تیس
(۵)	بکریاں		چالیس وغیرہ وغیرہ۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت قائم ہو تو اسے چاہیئے کہ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے۔ اگر ایسی حکومت نہ ہو، تو لوگ اپنے اپنے طور پر زکوٰۃ خرچ کر دیں۔ لیکن حکومت ہو یا افراد،

زکوٰۃ خرچ کی جائے گی انہی مصارف پر جن کا تعین کر دیا گیا ہے۔

(۲) قرآن کریم میں "زکوٰۃ" دینے کا حکم تو آیا ہے (جس کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے) لیکن جن باتوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں سے کوئی بات بھی قرآن مجید میں نہیں ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ (کم از کم) مصارف زکوٰۃ کی تصریح تو خود قرآن کریم نے کر دی ہے اور اس کے لئے ذیل کی آیت پیش کی جاتی ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹/۶۰)۔

شاہ رفیع الدینؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

سوائے اس کے نہیں کہ خیرات واسطے فقیروں کے اور محتاجوں کے اور عمل کرنے والوں کے اور تحصیل اس کی کے۔ اور جن کو کہ الفت دلائے جاتے ہیں دل ان کے۔ اور بیچ آزاد کرنے گردنوں کے۔ اور قرضداروں کو۔ اور بیچ راہ اللہ کے۔ اور مسافروں کو۔ فرض ہے اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ مصارف "صدقات" کے بتائے ہیں (جس کا ترجمہ شاہ صاحبؒ "خیرات" کرتے ہیں)۔ یہ "زکوٰۃ" کے مصارف نہیں۔ قرآن کریم نے "زکوٰۃ" کے لئے "زکوٰۃ" ہی کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے مصارف کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا ہم نے جو کہا تھا کہ زکوٰۃ کے متعلق ان امور کا جنہیں ہمارا اقامت پرست طبقہ پیش کرتا ہے، قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں آیا، تو یہ ایک حقیقت کا بیان ہے۔

۳ — کہا یہ جاتا ہے کہ یہ تمام تفاصیل نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ ہیں اس لئے یہ ہمارے غیر متبدل قوانین شریعت ہیں۔ (جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے) ہو سکتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے انہیں متعین فرمایا ہو لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اگر انہیں حضورؐ نے متعین فرمایا تھا تو آپؐ نے ایسا اپنے زمانے کے خصوصی حالات کے ماتحت کیا ہوگا۔ حضورؐ کا یہ منشاء نہیں ہو سکتا کہ یہ تفاصیل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح رہیں۔ اس کی دلیل واضح ہے۔ مثلاً

(۱) نصاب میں چاندی۔ سونے کا ذکر ہے۔ اُس زمانے میں نقدی، چاندی اور سونے ہی کی شکل میں ہوتی تھی۔ لیکن اب نقد مال چاندی، سونے میں ادل تو ہوتا ہی نہیں۔ اور اگر کہیں سا ور آن کی شکل میں ہوتا بھی ہے تو شاذ۔ (روپیہ بھی خالص چاندی کا نہیں ہوتا)۔ اب نقد مال، نوٹوں کی شکل میں ہوتا ہے

یا بینک کی ہنڈیوں وغیرہ کی شکل میں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس کچھ روپیہ نوٹوں کی شکل میں ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں۔ اور اگر ہوگی تو کس شرح سے؟ چاندی کی شرح سے یا سونے کی شرح سے۔ اور ایسا کرنے کے لئے کیا سند ہوگی؟

(۲) مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آجکل چاندی کا بھاؤ تین روپے فی تولہ ہے اور سونے کا نرخ ایک سو تیس روپے فی تولہ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مروجہ نصاب کے مطابق، جس شخص کے پاس قریب ڈیڑھ سو روپے کی مالیت کے چاندی کے زیورات ہوں گے اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ لیکن جس کے پاس آٹھ نو سو روپے تک کی مالیت کے سونے کے زیور ہوں گے وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگا؛ یعنی ڈیڑھ سو روپے رکھنے والے پر تو زکوٰۃ پڑ جائے گی لیکن آٹھ نو سو روپے رکھنے والے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، یہ تو پھر بھی کم فرق ہے۔ اس نصاب کی رو سے جس شخص کے پاس ڈیڑھ سو روپے کی مالیت کا چاندی کا زیور ہوگا اسے تو زکوٰۃ دینی پڑے گی لیکن اگر اس کے پاس انتیس گائے ہوں جن کی مالیت سات آٹھ ہزار روپے سے کم نہیں ہوتی، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ یعنی غریب پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اس سے نسبتاً امیر پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

آپ نے غور فرمایا کہ خود یہ نصاب بتا رہا ہے کہ (اگر اسے نبی اکرمؐ نے مقرر فرمایا تھا تو) یہ حضورؐ کے اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ہوگا جب چاندی۔ سونے، اونٹ۔ گائے کی قیمتوں کا تناسب ایسا ہوگا جس کی رو سے سب کے لئے نصاب یکساں ہو جائے۔ آج یہ صورت باقی نہیں رہی۔ آج اگر کسی کے پاس آٹھ سو روپے کے چاندی کے زیورات ہوں اور وہ سال ختم ہونے سے پہلے ان کی جگہ سونے کا زیور بنوا لے۔ یا تین چار گائے خرید لے، تو شریعت کی رو سے وہ زکوٰۃ دینے سے بچ جائے گا۔ شریعت کے غیر متبدل (ابدی) احکام ایسے نہیں ہوا کرتے۔ اس لئے یہ نصاب یا شرح حضورؐ کی طرف سے ابدی طور پر متعین فرمودہ نہیں ہو سکتی۔ تاریخ اس پر بھی شاہد ہے کہ بعض چیزیں جن پر رسول اللہؐ کے زمانے میں زکوٰۃ نہیں پڑتی تھی، خلافت راشدہ کے زمانے میں انہیں زکوٰۃ کی فہرست میں شامل کیا گیا۔

مثلاً تجارتی گھوڑوں اور سمندر سے برآمد شدہ چیزوں کو مد زکوٰۃ میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں شامل کیا گیا۔

لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ زکوٰۃ کی شرح بھی مستقل طور پر خدا اور رسولؐ کی مقرر کردہ ہے اور اس کے مصارف بھی انہی کے متعین فرمودہ۔ ظاہر ہے کہ اس مقرر شدہ شرح سے آمدنی بھی مقررہ حد تک ہو سکے گی۔ اب اگر صورت یہ پیدا ہو جائے کہ وہ ضروریات جنہیں مد زکوٰۃ سے پورا کیا جانا مطلوب ہے، زکوٰۃ کی آمدنی سے زیادہ ہوں تو اس وقت کیا کیا جائے گا؟

اس صورت میں یا تو آپ کو بعض ضروریات کو ویسے کا ویسا ہی رہنے دینا پڑے گا - اور یا آمدنی زکوٰۃ کے علاوہ کسی اور مد سے حاصل کرنی پڑے گی - غور کیجئے کہ ان دونوں صورتوں میں نتیجہ کیا نکلتا ہے - یہی ناں کہ خدا نے اور اس کے رسول نے ایک مکمل دین دیا ہے - اور اس دین کی کیفیت یہ ہے کہ جو آمدنی اس میں تجویز کی گئی ہے وہ ان ضروریات کو پورا نہیں کرتی جنہیں پورا کرنے کے لئے وہ آمدنی تجویز کی گئی تھی - تو سوچئے کہ غیر مسلم اس دین کے متعلق کیا اندازہ کریں گے جس کے متعلق ہمارا دعوےٰ ہے کہ وہ خدا کا آخری مکمل - اور غیر متبدل دین ہے!

(۴) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ہمارے قدامت پرست طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے زمانے میں، زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کا صرف کرنا، حکومت کے فرائض میں ہوتا ہے - لیکن جب ایسی حکومت نہ ہو تو پھر زکوٰۃ انفرادی طور پر دی جاسکتی ہے - ظاہر ہے کہ انفرادی زکوٰۃ ایک خاص شرح کے مطابق، خیرات ہی ہو گی (جیسی کہ یہ اب ہے) - لیکن پاکستان میں کیفیت عجیب ہے - زکوٰۃ ابھی تک انفرادی طور پر دی جاتی ہے - اور خود حکومت بھی یہ طے نہیں کرپائی کہ زکوٰۃ کا وصول کرنا اور صرف کرنا، اس کے فرائض میں داخل ہے یا نہیں - وہ اس مقصد کے لئے کبھی کوئی زکوٰۃ کمیٹی مقرر کر دیتی ہے کبھی اس کی وصولی کی کوئی اور صورت تجویز کر دیتی ہے لیکن وہ بھی اس انداز سے کہ جس کا جی چاہے اسے (گداگروں کی خیرات کی طرح) حکومت کی جھولی میں ڈال دے - جس کا جی چاہے اسے خود خرچ کر دے - اس میں سے جس قدر روپیہ حکومت کی تحویل میں آجاتا ہے (ہمیں معلوم نہیں کہ اب کچھ آتا بھی ہے یا نہیں) اس کے متعلق یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ اسے، حکومت کی باقی آمدنی سے بالکل الگ رکھ کر صرف انہی مدات پر صرف کیا جائے گا جنہیں مصارفِ زکوٰۃ کہا جاتا ہے -

(۵) اب ایک صاحب (ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ڈائرکٹر - اسلامک ریسرچ سنٹر) نے ایک بحث اٹھائی ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ

> (۱) اسلامی حکومت ایک ہی ٹیکس عائد کر سکتی ہے جسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے - اس کے علاوہ کوئی اور ٹیکس لگانا غیر اسلامی ہے -
>
> (۲) اگر حکومت موجودہ شرح کے حساب سے زکوٰۃ کا ٹیکس وصول کرے تو اس آمدنی سے حکومت کا کاروبار نہیں چل سکتا -
>
> (۳) اس لئے حکومت، ملک کی ضروریات کے مطابق، زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کر سکتی ہے -
>
> (بحوالہ المشرق - مورخہ ۸/۶/۶۷) -

اس تجویز کا جائزہ تو بعد میں لیا جائے گا لیکن اسے پڑھنے کے بعد جو بات برجستہ ذہن میں آتی ہے وہ "مدعی سست - گواہ چست" کی مثل ہے - حکومت، زکوٰۃ کو اپنا ٹیکس ہی نہیں سمجھتی - اور اگر اس مد میں کچھ جمع ہوتا ہے تو اسے اپنی

آمدنی سے الگ رکھتی ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک 'زکوٰۃ کی آمدنی سے حکومت کے کاروبار چلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ اور ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں کہ حکومت کا کاروبار چلانے کی واحد آمدنی زکوٰۃ کا ٹیکس ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ اس کی شرح میں ضروری اضافہ کرے۔ ڈاکٹر صاحب کو چاہیئے تھا کہ اپنی تجویز پیش کرنے سے پہلے حکومت سے تسلیم کرا لیتے کہ

(۱) حکومت اپنا کاروبار صرف ایک ٹیکس سے چلائے گی جسے از روئے شریعت زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

(۲) یہ ٹیکس از روئے قانون، حکومت کے خزانہ میں جمع کرانا ہوگا۔ اس کا ادا نہ کرنا، یا کسی اور کا اسے وصول کرنا، جرم ہوگا۔

اس کے بعد، یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ زکوٰۃ کی شرح کیا ہونی چاہیئے۔ حکومت سے یہ کچھ تسلیم کرائے بغیر اس بحث کی حیثیت محض نظری (ACADAMIC) رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف، حکومت کے قائم کردہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ڈائرکٹر ہیں۔ انہیں چاہیئے تھا کہ حکومت کے مالیاتی نظام کو اسلامی بنانے کی تجویز حکومت کے پاس بھیجتے اور اگر حکومت مناسب سمجھتی تو اس پر دوسرے ارباب علم و تحقیق کی آراء طلب کر لیتی۔

مخالفت

(۶) ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا گویا بھڑوں کے چھتے میں پتھر دے مارنا تھا۔ چاروں طرف سے مخالفت کا ہجوم امنڈ آیا اور جو کسی کے جی میں آیا اس نے کر ڈالا۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں "اللہ نے اس (یعنی مُلّا) کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کئے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا"[۱]۔ اس لئے جو کچھ اس مخالفت میں کہا گیا اس میں قدر مشترک یہی ڈنک تھا۔ نہ کسی کی طرف سے کوئی دلیل دی گئی۔ نہ کوئی معقول بات کی گئی۔ یہ ملحد ہے۔ بے دین ہے۔ افرنگ زدہ ہے۔ متجدد ہے۔ مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسے ادارہ تحقیقات اسلامیہ کی ڈائرکٹرشپ سے الگ کر دیا جائے" ـــــ اس ساری مخالفت کی علت غائی یہی مقطع کا بند نظر آتی ہے[۲]۔ ـــــ مودودی صاحب نے اس کے خلاف یہ دلیل دی ہے کہ "زکوٰۃ عبادات میں سے ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا"۔ یہ نکتہ ذرا وضاحت طلب ہے۔ ان حضرات نے احکام شریعت کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک کا تعلق خدا سے ہے اسے یہ "عبادات" سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرا دنیاوی

---

[۱] تفہیمات حصہ دوم۔ صفحہ ۳۵۰۔ [۲] جہاں تک "علوم شریعت" کا تعلق ہے، ان مخالفت کرنے والوں میں شاید ہی کوئی ڈاکٹر صاحب موصوف سے زیادہ لکھا پڑھا ہو۔ لیکن اس کے باوجود ان کے ڈائرکٹر ہونے کے خلاف ان حضرات کی طرف سے مسلسل ایجی ٹیشن کی جاتی ہے۔

معاملات سے متعلق ہے۔ اسے "معاملات" کہا جاتا ہے۔ "دین اور دنیا" کی یہ وہ ثنویت (DUALISM) ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ قرآن کی رُو سے دنیا کا ہر وہ کام جسے حکم خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہے۔ عبادت سے مراد ہی احکام خداوندی کی اطاعت ہے۔ یعنی خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔ اس میں دین اور دنیا کی تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا خود مودودی صاحب کو بھی اعتراف ہے، وہ اپنی کتاب تفہیمات (حصہ دوم) میں لکھتے ہیں۔

> ایک اور چیز جس کا ہماری عبادتوں کو ضعیف الاثر بنانے میں بڑا حصہ ہے دین اور دنیا کی علیحدگی کا غلط تخیل ہے۔ یہ دراصل جاہلیت کا اعتقاد تھا جس کو اسلام نے بالکل مٹا دیا تھا۔ مگر نہ معلوم اس نے کس طرح مسلمانوں میں راہ پالی۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دین انسانی زندگی کے شعبوں میں سے محض ایک شعبہ ہے جس کا دوسرے شعبوں سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہبی رسوم، عبادات اور قربانیاں محض اس لئے ضروری ہیں کہ خدا یا دیوتاؤں کو خوش کیا جائے، اور زندگی کے معاملات میں ان کی تائید حاصل کی جائے۔ ان فرائض کو انجام دے کر جب انسان عبادت گاہوں سے باہر نکلے تو مذہب سے اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور وہ مختار رہتا ہے کہ اپنی دنیا کے معاملات جس ڈھنگ پر چاہے چلائے۔ اسلام نے اس غلط حد بندی کو مٹایا۔ دین کو زندگی کا ایک شعبہ نہیں بلکہ پوری زندگی کا نظام العمل قرار دیا۔ عقائد اور اخلاق کے درمیان، ایمان اور سیرت کے درمیان، عبادات اور معاملات کے درمیان، مذہبی اعمال اور دنیوی اعمال کے درمیان ایک گہرا ربط قائم کیا۔ اور انسان کی دنیوی زندگی ہی کو بالکلیہ دینی زندگی بنا دیا۔ اس نے بتایا کہ دین اس دنیا کے معاملات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اسی دنیا کے کاروبار میں اللہ کے قانون کی پیروی، اور اس کے مقرر کئے ہوئے حدود کی پابندی، اور اس کی رضا کے اتباع کا نام دین ہے۔ عبادات اور معاملات دو مختلف چیزیں نہیں ہیں، بلکہ معاملات ہی میں حدود اللہ کی پابندی اور خوشنودیٔ الٰہی کی طلب، اور تقرب الی اللہ کی سعی کا نام عبادت ہے۔ (صفحہ ۱۸۳-۱۸۴)

آپ نے غور فرمایا کہ وہ "عبادات اور معاملات" میں تفریق کو کس طرح خلاف اسلام اور عہد جاہلیت کی یادگار قرار دیتے ہیں۔ لیکن اب جبکہ انہیں ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کی مخالفت مقصود ہے تو اس کے لئے دلیل یہ دیتے ہیں کہ زکوٰۃ کا تعلق عبادات سے ہے۔ معاملات سے نہیں اس لئے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا آپ نے دیکھا کہ یہ حضرات کس طرح دین سے کھیل کھیلتے ہیں!

زکوٰۃ ـــــ قرآن کریم کی روشنی میں

(۷) آئیے اب ہم دیکھیں کہ قرآن کریم کی رُو سے

زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے۔ الزکوٰۃ کے بنیادی معنی ہیں نشوونما۔ بالیدگی۔ بڑھنا۔ پھولنا۔ پھلنا۔ یعنی (GROWTH اور DEVELOPMENT)

قرآن کریم میں "اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ" کا حکم متعدد بار آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نظام کے یہ دو ستون ہیں۔ "اقامت صلوٰۃ" سے کیا مفہوم ہے، اس کے متعلق ہم اس وقت گفتگو نہیں کرتے۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہوئے۔ نشوونما دینا۔ کسی کے بڑھنے۔ پھولنے۔ پھلنے کا انتظام کرنا۔ اس کی (DEVELOPMENT) کا سامان مہیا کرنا۔

اب آگے بڑھئے۔ اسلامی نظام مملکت (جسے حکومت خداوندی کہا جاتا ہے) کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے جنہیں انسانوں کے متعلق خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ وہ حکومت جب خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے تو اس کا فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کے ان واجبات کو پورا کرے جن کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے۔

خدا نے قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت میں اپنے آپ کو رب العٰلمین کہا ہے۔ یعنی وہ ربوبیت عالمین کا ذمہ دار ہے۔ ربوبیت کے معنی ہوتے ہیں، کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے نشوونما دیتے ہوئے، اس کی تکمیل تک پہنچا دینا۔ اس سے واضح ہے کہ دیگر اشیائے کائنات کے علاوہ، نوع انسان کی عالمگیر نشوونما کا ذمہ بھی خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ اس ذمہ داری کے سلسلہ میں اس کا ارشاد ہے کہ

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

اور خود انسانوں کے سلسلہ میں فرمایا:

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم ان کے اور ان کی اولاد کے رزق (سامانِ زیست) کے ذمہ دار ہیں۔

خدا کی یہ وہ ذمہ داریاں ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے جماعتِ مومنین (اسلامی نظام) کو تشکیل کیا گیا تھا۔ یعنی انکی ذمہ داری تھی کہ وہ ایسا نظام قائم کریں جس سے تمام افرادِ انسانیہ کو ان کی نشوونما کا سامان ملتا رہے۔ اسے اس نے "ایتائے زکوٰۃ" — سامان نشوونما دینے — کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ دیکھئے، اس حقیقت کو قرآن کریم کس قدر وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ سورۃ الحج میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ.... (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں حکومت مل گئی تو یہ اقامت صلوٰۃ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی حکومت کا فریضہ "ایتائے زکوٰۃ" — زکوٰۃ دینا — ہے۔ یعنی نوعِ انسان (یا

افراد معاشرہ) کو سامان نشوونما عطا کرنا۔ اس اعتبار سے حکومت کی ساری آمدنی (REVENUE) کو زکوٰۃ (یعنی سامانِ نشوونما) کہا جائے گا، جسے وہ افراد معاشرہ اور اس کے بعد عالمگیر انسانیت کو دینے کے لئے حاصل کرے گی۔ اس کے لئے وہ کیا انتظام کرے گی۔ لوگوں کی کمائی میں سے کس قدر لے گی۔ اس کا تعین ضروریات کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ لہٰذا، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی تجویز کا یہ حصہ تو درست ہے کہ اسلامی حکومت کا سارا کاروبار زکوٰۃ سے چلتا ہے اور وہ اس میں، حسب ضرورت، ہر وقت ردوبدل کر سکتی ہے۔ اس کا ہر سال کا بجٹ اس کی ضروریات کے مطابق مرتب ہوگا، لیکن ان کی تجویز کا یہ حصہ درست نہیں کہ زکوٰۃ ایک ٹیکس کا نام ہے۔ اور اس کے علاوہ حکومت کوئی اور ٹیکس لگا نہیں سکتی۔ زکوٰۃ کسی خاص ٹیکس کا نام نہیں۔ اسلامی حکومت کی پوری کی پوری آمدنی زکوٰۃ کہلا سکتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ان لفظی پیچیدگیوں میں الجھنے کے بجائے، ہمیں قرآن کے مفہوم کے مطابق یوں کہنا چاہئے کہ

اسلامی مملکت کا ایک بنیادی فریضہ ایتائے زکوٰۃ ہے۔ یعنی تمام افراد معاشرہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔

اس مقصد کے پیش نظر اس کی تمام آمدنی زکوٰۃ۔ یعنی ذریعۂ نشوونما کہلا سکتی ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سال میں بعض ہنگامی حالات ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کے لئے بجٹ میں گنجائش (PROVISION) نہیں ہوتی۔ مثلاً سیلاب۔ زلزلہ۔ وبا۔ جنگ وغیرہ۔ ان کے لئے ملک سے خاص عطیات کی اپیل کرنی پڑتی ہے۔ انہیں قرآن کریم نے "صدقات" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ میں (جو پہلے درج کی گئی ہے) جن "مصارف" کا ذکر ہے وہ صدقات کے مصارف ہیں — "زکوٰۃ" کے نہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

(۱) جو کچھ آجکل زکوٰۃ کے نام سے دیا جاتا ہے، اسے زکوٰۃ سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے آپ خیرات کہہ سکتے ہیں۔

(۲) زکوٰۃ کے لئے اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔

(۳) اسلامی حکومت "زکوٰۃ دیتی ہے"۔ یعنی لوگوں کے لئے سامان نشوونما بہم پہنچاتی ہے۔

(۴) اس فریضہ کی ادائیگی کے پیش نظر اسلامی مملکت کی ساری آمدنی زکوٰۃ (یعنی ذرائع نشوونما) کہلا سکتی ہے۔ اس آمدنی کی نہ کوئی غیر متبدل شرح ہے نہ خاص نصاب۔ حکومت اسے ضروریات کے مطابق خود متعین کرتی ہے (نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ نے اسے اپنی ضروریات کے مطابق مقرر کیا ہوگا)۔

(۵) ہنگامی حالات کے لئے عطیات کو صدقات کہا جاتا ہے۔

اصطلاحی طور پر بھی دیکھا جائے تو قرن اوّل میں حکومت کی آمدنی کی تین بنیادی مدات سامنے آتی ہیں۔ غیر مسلموں سے جزیہ، زمین کا لگان (خراج) اور باقی تمام آمدنی کو زکوٰۃ کہا جاتا تھا۔ اندازہ یہ ہے کہ لگان کے لئے اصطلاح انتظامی سہولت

کے لئے رکھی گئی ہوگی۔

(۸) ہم نے اس گفتگو کو "زکوٰۃ" تک محدود رکھا ہے۔ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اور مملکت، اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے افراد سے کس حد تک لے سکتی ہے۔ ان نکات کا تعلق معاشی نظام سے ہے جسے ہم طلوع اسلام میں شرح وبسط سے پیش کر چکے ہیں۔ اس مقام پر اتنی وضاحت اور کر دی جائے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی رو سے، حکومت اور امت دو الگ الگ ادارے نہیں ہوتے۔ ساری کی ساری امت، حکومت میں شریک ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ امت اپنے اجتماعی نظم وضبط کے لئے جو مشینری وضع کرتی ہے اسے حکومت کہتے ہیں۔ اس لئے جب یہ کہا جائے گا کہ اسلامی حکومت زکوٰۃ دیتی ہے۔ تو اسے یوں بھی کہا جا سکے گا امت مسلمہ (جماعت مومنین) زکوٰۃ دیتی ہے۔ یعنی نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔

(۹) باقی رہا یہ کہ شریعت کے جو احکام، نقبا تو ایک طرف خود رسول اللہؐ کے مقرر کردہ ہیں حالات کی تبدیلی سے ان میں تغیر وتبدل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق بھی ہم سے نہیں، خود مودودی صاحب کی زبان سے سنئے۔ وہ تفہیمات (جلد دوم) کے صفحہ ۳۲۷ پر رقمطراز ہیں:۔

> یہ حقیقت یقیناً ناقابل انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجاآوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہد رسالت اور عہد صحابہ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کی ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح وحکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا ردوبدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روح اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔

خود تو یہ فرماتے ہیں اور جب کوئی دوسرا یہی بات کہتا ہے تو اسے ملحد و بے دین قرار دیتے ہیں۔

باقی رہا یہ کہ اس امر کا فیصلہ کون کریگا کہ کس حکم میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور وہ تبدیلی کیا ہونی چاہیئے، تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ اس کا فیصلہ "مزاج شناس رسول" کریگا — اور مزاج شناس رسول وہ خود ہیں[1]۔

---

[1] میر عدالت میں جماعت اسلامی کے معتمد علیہ عامدؔ اس کا اعلان کر چکے ہیں اور مودودی صاحب نے کبھی اس کی تردید نہیں کی۔

اور ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس کا فیصلہ اسلامی حکومت کرے گی۔ اس جرم کی پاداش میں ہمیں منکرِ سنت قرار دیا جاتا ہے ـــــ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے!

کچھ کتابوں کی بابت!

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع شدہ کتابوں نے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یہی ہمارے لٹریچر سے مقصود ہے۔

(۲) طلوعِ اسلام ایک مشنری ادارہ ہے اور اس کی قرآنی تحریک کے قیام اور فروغ کا دار و مدار پبلشنز اپنی کتابوں کی آمدنی پر ہے اس لئے اس باب میں آپ کا تعاون خود اس تحریک تائید کا موجب بھی ہوگا

(۳) کتابوں کا اشتہار آپ کو رسالہ کے مختلف مقامات پر ملیگا۔ نیز رسالے کے اندر ایک کارڈ چسپاں ہوگا جس میں ان کتابوں کی فہرست درج ہوگی اس سے آپ کتابوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

(۴) کتابوں کی فرمائش بھیجتے وقت ضروری ہے کہ آپ فرمائش کی مجموعی قیمت کا کم از کم دسواں حصہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں۔ بقایا کا وی۔ پی آپکے نام بھیجدیا جائے گا۔

(۵) کتابوں پر ڈاک کا خرچ بہت پڑ جاتا ہے اگر آپ اس خرچ کی بچت چاہتے ہیں تو اس کے لئے آپ ہمارے "پیشگی خریداروں کے حلقہ میں شامل ہو جایئے۔ اسکا طریقہ یہ ہے کہ آپ سو روپے کی رقم (یک مشت یا چار اقساط میں) پیشگی جمع کرا دیں۔ اسکے بعد جو کتاب آپ طلب فرمائینگے آپ کو بھیجدی جائیگی اور اسکے ڈاک کا خرچ ہم خود برداشت کریں گے۔ آپکا حساب ہمارے ہاں باقاعدہ رہے گا اور زرِ پیشگی کے ختم ہونے پر (یا ساتھ کے ساتھ) آپ اس میں مزید پیسے جمع کرا دیں گے۔

(۶) دستی کتابیں ادارہ سے (دفتر کے اوقات میں) مل سکتی ہیں۔

(۷) احتیاط کے باوجود حساب میں بعض اوقات غلطی ہو سکتی ہے اس لئے حساب فہمی میں ضبط و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ دانستہ بدمعاملگی اس ادارہ میں کبھی نہیں ہوگی۔

والسلام ـــ (ناظم)

کراچی میں

(۱) پرویز صاحب کا ہفتہ واری درسِ قرآن کریم (بذریعہ ٹیپ ریکارڈر) ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے سندھ اسمبلی ہال۔ بندر روڈ میں، نہایت تزک و احتشام سے ہوتا ہے۔

(۲) طلوعِ اسلام کا شائع کردہ لٹریچر ـــ پرویز صاحب کی تمام کتابیں ـــ محمد اسلام صاحب نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام ۱۱۲/۳۔ لوئس روڈ۔ نیو ٹاؤن۔ سے مل سکتا ہے۔ دستی بھی اور خط لکھنے پر بذریعہ وی۔ پی بھی۔ اتوار کی صبح یہ لٹریچر سندھ اسمبلی ہال کے باہر بھی مل سکتا ہے۔

محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب

عمل

طلوعِ اسلام کنونشن کا مقالہ

(۱)

اللہ کی طرف سے انسانوں کو زندگی کے غیر متبدل اصول ملے ہیں۔ ان اصولوں کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ قرآن انسانوں کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ ہدایت اس میں یہ ہے کہ آدمی کو انسان کی سی زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیئے۔ آدمی اول حیوان ہے اور اس کے بعد انسان۔ قرآن نے یہ فارمولا دیا ہے کہ آدمی انسان کس طرح بنتا ہے۔ قرآن ایک نسخہ ہے جس میں اس تمام نفسیاتی کشمکش کا علاج ہے جو انسان کے قلب کو مضطرب رکھتی ہے۔ لیکن ان اصولوں کا صرف علم حاصل کر لینا کوئی فائدہ نہیں دیتا جب تک کہ ان پر عمل نہ ہو۔ بقول محترم پرویز صاحب کسی طبیب سے نسخہ لے کر اسے پاس رکھ چھوڑنا یا اس نسخہ کی موزونیت کا اعتراف کرنا یا نسخہ کے کاغذ کو پانی میں گھول کر پی لینا مرض کے لئے نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ شفا اس وقت ہوگی جب طبیب کی تجویز کردہ دوائیوں کو اس کی ہدایت کے مطابق استعمال کیا جائے۔ نسخہ کے دستیاب ہونے پر یقین ایمان ہے۔ لیکن اس ایمان کے ساتھ نسخہ پر عمل کرنا ضروری ہے اور اسی میں شفا کا راز مضمر ہے۔ اسی لئے قرآن نے ہر جگہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح کا ذکر کیا ہے۔ ایمان اور عملِ صالح لازم و ملزوم ہیں چنانچہ قرآن کہتا ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۔ (۲۹/۲)

کیا یہ لوگ اتنا ہی کہنے سے چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اور ان کی آزمائش نہ ہوگی۔

کس قدر غلط ہے جو یہ لوگ سوچتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سارا سلسلہ کارگاہ اسی لئے ہے کہ جو فارمولا دیا گیا ہے اس کا نتیجہ عمل سے مرتب ہو۔ پھر کہا۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ (۱۱/۷)

وہی تو ہے جس کا زندگی کے سرچشمے کے اوپر کنٹرول ہے اور جس نے ان پستیوں اور بلندیوں کے سلسلے کو متعدد اوقات میں مکمل کیا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ تمہاری نمو و ذات کے مواقع بہم پہنچائے جائیں تاکہ دیکھا جاسکے کہ کون توازن بدوش انداز سے زندگی بسر کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ (۶۷/۲)

اس نے موت اور حیات کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے تاکہ دیکھا جاسکے کہ آیا تمہاری ذات میں اتنا استحکام پیدا ہو گیا ہے کہ موت کا دھچکا بھی اسے ہلا نہ سکے۔

یہاں انسانوں کے مدارج بھی عمل کے اعتبار سے متشکل ہوتے ہیں:۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۔ (۴۶/۱۹)

مریض کو شفا اسی نسبت سے ملتی ہے جس نسبت سے نسخہ پر عمل کیا گیا ہو۔ چنانچہ انسانی زندگی پیہم عمل ہے۔ خود حضور نبی اکرمؐ کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ آپ کی زندگی میں مخالفتوں کا ہجوم رہا۔ باطل کی قوتوں سے مسلسل ٹکراؤ رہا۔ سخت کشمکش کی زندگی تھی لیکن اسی کشمکش میں کامیابی کا راز ہے۔ حضورؐ کو اپنے پروگرام کی صداقت پر یقین اور عملِ پیہم کے اٹل نتائج پر مکمل اعتماد تھا چنانچہ آپ کی زبانی کہلوایا:۔

يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۔ (۱۱/۹۳)

مخالفین سے کہو کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرتے جاؤ۔ میں اس میں مداخلت نہیں کروں گا اور میں اپنے فارمولے پر عمل کرتا جاؤں گا، تاآنکہ بات نکھر کر سامنے آجائے کہ کون جھوٹا ہے اور کس کی کوششوں کا نتیجہ ذلت اور خواری ہے۔

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ نتیجہ عمل سے نکلتا ہے۔ خالی علم و یقین کوئی شے نہیں۔ اب غور فرمائیے کہ اعمالِ صالح کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ از روئے قرآن اعمالِ صالح کا نتیجہ جنت ہے قرآن نے جنت کے متعلق کہا ہے کہ جنت دراصل وہ ہے جو اعمال کے نتیجے کے طور پر ملے جب خون جگر سے حاصل کیا جائے۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ - (۴۳/۷۲)

یہ جنت وہ ہے جو تمہارے اعمال کے نتیجہ کے طور پر تمہاری وراثت میں آئی ہے۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ -

یہ جزا ہے ان اعمال کی جو تم کرتے ہو۔

نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ - (۲۹/۵۸)

اور یہ کتنا اچھا اجر ہے جو عمل کرنے والوں کو ملتا ہے۔

گویا۔ جنت تمہارے اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ ہے۔ چنانچہ یہ تصور کہ صرف کلمہ پڑھ لینے سے یا ورد وظیفہ کہنے سے جنت مل جاتی ہے، غیر قرآنی ہے۔ جنتی معاشرہ کے قیام کے لئے مسلسل محنت، کوشش اور دشوار گذار گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم جماعتِ مومنین سے خطاب کرکے واضح اعلان کرتا ہے

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم
مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا
مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ أَلَآ إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ (۲/۲۱۴)

اے جماعتِ مومنین! تم یہ سمجھ لینا کہ تم اس جنتی معاشرے کو یونہی حاصل کر لوگے اور مفت میں جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ایسا نہیں ہو سکے گا تمہیں بھی ان جانگداز مراحل میں سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے تم سے پہلے اس انقلاب آفرین کی کوشش کی۔ سختیاں اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے یہاں تک کہ وہ اور ان کے رسول پکار اٹھتے کہ بارِ الٰہا۔ ہماری کوششوں کے بارآور ہونے کا وقت کب آئے گا۔ ایسے ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل سے گذر کر ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور تائیدِ ایزدی ان کے سعی و عمل کو ثمر بار کرتی۔ اے جماعتِ مومنین! تمہیں بھی ان مراحل میں سے گزرنا ہوگا اور یوں اللہ کی نصرت تمہارے قریب آئے گی۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ زندگی مسلسل جہاد کی زندگی ہے۔ کندن وہی بن سکتا ہے جو ناسازگار حالات کی کٹھالی میں سے گزرے۔ یہ محو و ثبات کا وہ محکم اصول ہے جس کے مطابق قومیں مٹتی اور باقی رہتی ہیں۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا
مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ - (۳/۱۴۲)

یہ نہ سمجھ لینا کہ یوں بیٹھے بٹھائے کامرانیوں اور خوشگواریوں کی زندگی مل جائیگی۔ جنت حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنے کردار سے بتانا ہوگا کہ تم میں سے کون مسلسل جد وجہد کرتا ہے اور باطل کے ساتھ ٹکراؤ میں ثابت قدم رہتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (۹/۱۱۱)

اس جنتی معاشرے کے حصول کے لئے اللہ کے ساتھ جان اور مال کا سودا کرنا پڑتا ہے۔ مال کو سدا اوسینے جانا اور جان کو ہتھیلی پر لئے پھرنا یہ جہاد مسلسل کی زندگی ہے جس سے جنت حاصل ہوتی ہے۔ جنت حاصل کرنے والوں کا طریق یہ ہوتا ہے کہ جب جہاد ہو تو اس میں شامل ہو اور جب جہاد نہ ہو تو اس کی تیاری میں معروف رہے۔ جہاد مسلسل کا نتیجہ اس دنیا میں بھی خوشگواریاں اور آخرت میں بھی خوشگواریاں ہیں۔ فِیْھَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا۔ (۲۵/۷۶)۔۔۔ قوموں کی حیات عمل پیہم کے ساتھ وابستہ ہے اور عمل پیہم کا نتیجہ تمکن فی الارض اور امن ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ۔ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا (۲۴/۵۵)

جو لوگ اللہ کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں۔ اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں اس خطہ ارض پر حکومت عطا کر دے گا۔ یہ ابدی قانون ہے جس کے مطابق اقوام سابقہ کو حکومت عطا کی گئی اور اسی کے مطابق ان مومنین کو ملے گی اور ان کے اس نظام زندگی کو محکم کر دیا جائے گا جسے ان کے لئے پسند کیا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا خوف امن میں بدل جائے گا۔

لیکن تمکن فی الارض کے بعد بھی عمل کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ یہ مزید اعمال صالح کے لئے ایک پلیٹ فارم کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ قیام صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے dynamic پروگرام پھر جاری رہتے ہیں تاکہ انسانیت اپنے نصب العین کے حصول کے لئے مزید ارتقائی منازل طے کرتی جائے۔ یہی تمکن فی الارض اور خوف کا امن میں بدل جانا ہی جنت ارضی ہے۔ جس میں عمل کرنے والے اپنی تمناؤں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَہٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّۃِ حَیْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (۳۹/۷۴)

وہ زندگی کے اس حسین نقشے کو دیکھ کر داد تحسین دیتے ہوئے کہیں گے کہ اللہ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا۔ اب ہم جنت میں اپنی آرزوؤں کے مطابق رہیں۔ عمل کرنے والوں کا بدلہ کتنا خوشنما ہے۔ چنانچہ مومن کی زندگی مسلسل عمل اور جد و جہد کی زندگی ہے۔

مورخین جب اس باب پر آتے ہیں کہ تیرہ سو سال پیشتر عربوں نے اقوام عالم پر برتری کیسے حاصل کی تو وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ برتری دراصل نتیجہ تھا اس فارمولے پر عمل کرنے کا جسے رسول اکرمؐ نے مکمل ترین شکل میں انسانوں کو دیا تھا۔ دراصل جو بات حیران کن ہے وہ یہ ہے کہ جب اس فارمولے پر عمل کرنے والی قوم آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئی اور اس نے اعمال صالح کے نتائج کو دو اور دو چار کی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو پھر اس قوم کو زمین کی پستیوں میں کس چیز نے پٹخ دیا۔ جب اس قوم کو معلوم تھا کہ فارمولا یہ ہے اور اس کے نتائج یہ ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اپنے راستے سے بھٹک گئی اور وہ کیا عناصر تھے جنہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اسے مصاف زندگی میں پچھاڑ دیا۔

برادران! سنیئے ـــــ ہوا یہ کہ جب اس فارمولے پر عمل نے عربوں جیسی جاہل اجڈ اور کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارہ کرنے والی قوم کو تمکن فی الارض عطا کر دیا تو مخالف قومیں اسے برداشت نہ کر سکیں۔ اور یہ مخالف قومیں وہ تھیں جن میں اس زمانے کا بہترین INTELLIGENTSIA موجود تھا۔ یہ رومن اور ایرانی قومیں بڑی پرانی تہذیب کی مالک تھیں انہوں نے اس راز کو پالیا کہ جب تک یہ عرب قرآن پر عمل کرتے ہیں دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان کو شکست دینے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ان کو قرآن سے بیگانہ کر دیا جائے۔ جس فارمولے پر یہ عمل کرتے ہیں اسے ان کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے یہ تاریخ کا بہت بڑا موڑ ہے۔ قرآن پر عمل سے بیگانہ کرنے کی سازشوں کو کامیاب بنانے کی داستان بڑی عجیب اور دلخراش ہے۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔ اس لئے یہ مخالفین کے بس کا روگ نہ تھا کہ اس کے الفاظ کو بدل سکیں۔ چنانچہ انہوں نے سوچا کہ الفاظ تو وہی رہیں لیکن ان کا تصور بدل دیا جائے۔ چنانچہ یہ پہلی سازش تھی جو وضع کی گئی کہ قرآن کے معنی وہ نہیں جو الفاظ سے لئے جاتے ہیں بلکہ اس کے باطنی معنی ہوتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ ورد وظیفہ کے لئے ہیں اور وظائف سے عجیب نتائج نکلتے ہیں۔ مذہب کی حیثیت سے یہ جنتر منتر پہلے یہودیوں میں موجود تھے۔ بعد ازاں یہ چیزیں ہندوؤں کے اندر آئیں اور پھر یہ غیر مسلموں کی سازشی تدبیروں سے مسلمانوں میں آکر عین دین بن گئیں۔ اور اب ہزار برس سے مسلمان ان کو سینے سے لگائے پھرتا ہے۔ اب اسی ورد وظیفے کا نام قرآن پر عمل ہے اور دیہات میں شہروں میں ہر جگہ آپ کو پیشہ ور عامل نظر آئیں گے جو عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر رات دن اپنی دکانداری چمکانے

ہیں مصروف ہیں۔ قرآن کی فلاں آیت کو زعفران سے لکھ کر رات کو پانی میں بگھوئیے اور صبح اٹھ کر چھان کر پی لیجئے۔ اس کا یہ اثر ہوگا اور فلاں کا وہ اثر ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ قرآن نے رسولؐ سے کہا تھا کہ تم عام انسانوں تک ہمارا پیغام پہنچاؤ۔ لیکن اب کہا جاتا ہے کہ خدا کے خاص بندے ہی بتا سکتے ہیں کہ الفاظ قرآنی کے کیا معنے ہیں۔ یہ باتیں فقیروں اور جہلا کی نہیں یہ ان لوگوں کی ہیں جن کو دین میں سند مانا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے ایسے نسخے موجود ہیں جن میں ہر آیت پر نشان دہی کی ہوئی ہے کہ یہ فلاں فلاں وظیفے میں پڑھی جاتی ہے اور فلاں فلاں مرض کا علاج ہے۔ میں اس کی تفصیل کو کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں صرف مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مولانا اشرف علی تھانوی کے مجموعہ اعمال قرآنی میں درج ہے کہ سورہ بقرہ میں جو گائے ذبح کرنے کا قصہ ہے اس آیت کو پڑھ کر خربوزہ چیرا جائے تو یقیناً میٹھا نکلے گا۔ ان کتابوں میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے قصے موجود ہیں۔

برادران! آپ کبھی کسی ایسی کتاب کو نہیں پڑھتے جسے آپ سمجھ نہ سکیں۔ لیکن ہمارے مولوی صاحبان کہتے ہیں کہ قرآن کے مطالب سے کوئی واسطہ نہیں اس کے الفاظ کو دہرانا مقصود ہے۔ ایک مولوی صاحب جو لاہور کی ایک اچھی بارونق مسجد کے خطیب ہیں، میں نے ان سے ایک مرتبہ ذکر کیا کہ فلاں مدرسہ میں چھوٹے بچوں کو قرآن مجید با ترجمہ پڑھایا جاتا ہے تو انہوں نے اس کی سختی سے مخالفت کی اور کہا کہ یہ طریق غلط ہے قرآن کا پڑھنا صرف ثواب کی خاطر ہے۔ چنانچہ جب قرآن کی آیات سے اسی طرح معجزے دکھانے شروع کئے گئے جس طرح کرشن کی مورتی کی پوجا کرنے والے کرتے ہیں یا HYPNOTISM والے کرتے ہیں۔ تو قوم قرآن سے بیگانہ ہوتی گئی۔

قرآن پر عمل سے بیگانہ کرنے کے لئے دوسرا طریق یہ استعمال کیا گیا کہ الفاظ قرآنی کی غیر قرآنی تفسیر پیش کی گئی اور اسے نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ چونکہ حضورؐ نے امت کو قرآن کے سوا اور کوئی دوسری کتاب نہیں دی۔ اس لئے کسی دوسرے ریکارڈ کی عدم موجودگی میں یہ CHECK کرنا مشکل ہو گیا کہ جو بات حضورؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ جن لوگوں نے اس کا محاسبہ کیا انہوں نے صرف یہ دیکھا کہ جن چار پانچ شخصیتوں کے نام لئے جاتے ہیں کہ ان کی وساطت سے نبی اکرمؐ کی فلاں بات معلوم ہوئی۔ وہ سچے تھے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ فلاں بات واقعی سچی ہے۔ لیکن اس بات کی کوئی سند نہیں کہ ان اشخاص نے بھی حقیقتاً فلاں بات کہی۔ چنانچہ غیر قرآنی تصورات کو اسلام کے اندر اس چور دروازے سے داخل کیا گیا۔ اگر کسی آیت کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ اس کی تفسیر خود حضورؐ نے یہ فرمائی تھی تو اس کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی مسلمان اس سے اختلاف

کرے۔ لیکن نہ نبی اکرمؐ نے تفسیر کی کوئی کتاب تیار کروائی نہ صحابہؓ نے۔ سب سے پہلی تفسیر بھی حدیث کی طرح حضورؐ کی وفات سے ۳۰۰ سال بعد لکھی گئی اور اس میں جو کچھ لکھا گیا وہ نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ چنانچہ قرآن پر غور و فکر کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ قرآن کے الفاظ کی طرح اس کا مفہوم بھی ہمیشہ کے لئے متعین ہو گیا۔

اس سے اور آگے چلئے۔ پھر کہا گیا کہ حضور جو کچھ فرماتے تھے وہ ان کا اپنی طرف سے نہ تھا بلکہ یہ خدا کی طرف سے وحی ہوتی تھی۔ یعنی یہ وحی قرآن سے الگ ایک وحی تھی۔ چنانچہ اس سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن میں جو بار بار تدبر اور تفکر کی تاکید ہے اسے نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ جس تفسیر کو حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے نہیں ہو سکتی اور کس طرح غلط روایات کو وضع کر کے ان کو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کیا گیا۔

قرآن پر عمل سے بیگانہ کرنے کی اگلی سازش جس کی وجہ سے مسلمان نے عقل و فکر سے کام لینا یکسر چھوڑ دیا ــــ تصوف ہے ــــ جو اسلام کی سرزمین میں بالکل اجنبی پودا ہے۔ لیکن اس کی جڑیں بہت دور تک جا چکی ہیں جس طرح مذہب کا لفظ دنیا کی ہر زبان اور ہر زمانے میں ملتا ہے لیکن اس کی DEFINITION آج تک کسی نے نہیں بتائی۔ اسی طرح تصوف کی بھی کوئی DEFINITION نہیں۔ تصوف کے متعلق اسلام سے پہلے الفاظ بھی مختلف تھے۔ قدر مشترک دو چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے اور دوسرے خدا کے ساتھ براہ راست مکالمہ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چیزیں انسان کے باطن میں ہوتی ہیں۔ ان کو باطنی مشاہدات (INNER EXPERIENCE) کہتے ہیں۔ ان سے ایک UN-SEEN WORLD نظر آتی ہے جس کی چیزیں بے نقاب نظر آتی ہیں۔ منتہا و مقصود یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے اور کہا جاتا ہے کہ حقیقت اس مادی دنیا سے ماوراء بلکہ اس کی ضد ہے۔ اس لئے وہ شخص حقیقت کے قریب ہوتا جائے گا جو مادی دنیا سے الگ ہوتا جائے اور جب یکسر ترک کر دے تو یکسر قریب ہو جائے۔ اس کا پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان اس قدر محو ہو جاوے کہ آنکھیں ہوں لیکن دیکھے نہیں۔ کان ہوں لیکن سنے نہیں۔ زبان ہو لیکن بولے نہیں۔ اگلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ نہ کوئی چیز دیکھ سکتا ہے نہ ہی کسی چیز کا خیال آتا ہے اسے COMPLETE DARKNESS کہتے ہیں۔ جب تک یہ نہ ہو نور سامنے نہیں آتا۔ یہ ایک خاص مرحلہ ہے جس کے لئے چلہ یا ریاضت کرائی جاتی ہے۔ اس سے پہلے وہ اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ حقیقت اس کے سامنے آئے۔ جو چیزیں اس طرح منکشف ہوتی ہیں وہ حتمی اور یقینی ہیں، باقی سب قیاسی ــــ ان کے نزدیک قرآن کے الفاظ محسوس شکل میں ہیں اس لئے وہ بھی

قیاسی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کی سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفقود ہو جائیں۔ اسے MYSTICISM یا حقیقت یا معرفت کہتے ہیں۔

اسلام سے پہلے چار بڑے مذاہب تھے۔ یہودیت، نصرانیت، بدھیت اور بدھ مت۔ ان میں سے مجوسیت اور بدھ مت کے اندر وحی کا کوئی خاص تصور نہیں، لیکن یہودیت اور عیسائیت کے اندر وحی کا ایک خاص تصور ہے۔ لیکن یہودی جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی کہتے ہیں اسی طرح SAINTS کو بھی نبی کہتے ہیں مثلاً یرمیاہ نبی، دانیال نبی وغیرہ۔ اصل میں یہودیوں کے ہیکل میں نبی ایک منصبدار ہوتا تھا جو پیشگوئیاں کرتا تھا۔ اسی سے PROPHET کا لفظ وجود میں آیا۔ ان نبیوں کے متعلق عقیدہ تھا کہ یہ حقیقت کا براہِ راست مشاہدہ کرتے تھے اور اسی کو وہ وحی کہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے الہام کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحی جلی جو صاحب کتاب نبی کو ملتی ہے، اور ایک وحی خفی جو ہیکل کے نبیوں کو ملتی ہے۔

یہودیوں کے بعد عیسائی بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک خاص مقام دیتے ہیں اور انہیں خدا بھی مانتے ہیں۔ اس کے بعد بڑے بڑے بزرگوں کو SAINTS کہتے ہیں۔ ان کے متعلق بھی ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملتا ہے۔ لیکن یہ علم ویسا نہیں جیسا عیسیٰ علیہ السلام کا۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ خود خدا ہیں۔ لیکن بہرحال وہ کہتے ہیں کہ SAINT کو بھی علم براہِ راست خدا کی طرف سے ہی ملتا ہے۔

یہ چیزیں کسی قوم میں اس وقت آتی ہیں جب اس کا نظام اور مرکز بگڑ جائے۔ یہودیوں کا جب بیت المقدس کا مرکز بگڑا تو لاکھوں یہودی بابل کی طرف چلے گئے۔ ایک صدی کے اندر انہوں نے دیگر مذاہب کے جو عام تصورات پھیلے ہوئے تھے انہیں دیکھا اور ان کے بڑے لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہمیں پیشین گوئی ہوئی ہے کہ ہماری شان و شوکت دوبارہ لوٹ آئے گی۔ انہوں نے کہا کہ بیشک یہ کتابوں کے اندر موجود نہیں لیکن اس کا علم ہمیں براہِ راست ہوا ہے۔ یہ پہلا بیج تھا یہودی تصوف کا۔ اس سے پہلے یہودی صاحب شریعت تھے۔ PHILO ان کے اندر تصوف کا امام سمجھا جاتا ہے۔ دو ہزار سال سے دنیا اس کے طلسموں میں گرفتار چلی آتی ہے۔ اس نے کہا کہ مادی دنیا کا کوئی وجود ہی نہیں یہ ایک سراب ہے تصورات کی دنیا اصلی دنیا ہے۔ یہ دنیائے محسوسات اس کا سایہ ہے۔ PHILO نے جو سکندریہ میں تھا یہودیوں کے اندر یہی عقائد پھیلائے کہ توراۃ کے اندر جو چیزیں شریعت کے طور پر دی گئی ہیں۔ وہ دراصل معرفت کی چیزیں ہیں۔ تالمود یہودیوں کا پہلا مدون ضابطہ ہے۔ اس میں ہے کہ توراۃ کی

روح دراصل اس کے باطنی معنوں میں ہے (یعنے خدا کے دیئے ہوئے الفاظ بھی نعوذ باللہ فریب ہیں) انسان ہر وقت خدا کو دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان باطنی معنوں کو لے اور ان کے مطابق زندگی بسر کرے اس سے وہ حقیقت کو پا جاتا ہے

پھر انہوں نے کہا کہ نبیوں کی لائی ہوئی چیزیں تو عام انسانوں کے لئے ہیں۔ لیکن معرفت کی چیزیں صرف خاص آدمیوں کو دی جاتی ہیں۔ باطنی معانی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں مل سکتی اور ایک آدمی کو بھی نہیں جب تک وہ ولایت نہ حاصل کرے۔ پھر یہ عقیدہ عام ہوا کہ ابجد کے حروف کے اندر عجیب وغریب تاثیر پائی جاتی ہے اور ہر حرف کے کچھ اعداد مقرر ہیں اور ہر عدد کی ایک خاص تعبیر ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ بھی Philo نے جاری کیا۔ اس کی کتاب میں لکھا ہے کہ خدا نے ان اعداد کے نقوش تیار کئے۔ ڈھانچے بنائے اور ان میں سے ہر ایک کی کائنات کے اندر ایک روح پیدا کی۔

برادران! ایک کتاب اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے کہ آپ اسکا کچھ مطلب سمجھ سکیں اور اس پر عمل کریں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اس کے معانی باطن میں ہیں تو کتاب عملاً مٹ جاتی ہے — دو طرح کے لوگ ہوئے ہیں۔ احبار یعنی اہل شریعت — اور رہبان جنہوں باطنی معانی کو اصل سمجھا ہو۔ اہل شریعت کے نزدیک بھی ضابطہ تبھی کچھ معنی رکھتا ہے جب ایک نظام قائم ہو۔ جب نظام قائم نہ ہو تو نتیجہ کچھ نہیں۔ چنانچہ نظام بگڑنے کے بعد اہل شریعت نے کہنا شروع کر دیا کہ نتیجہ اس دنیا میں نہیں اگلی دنیا میں نکلے گا۔ معرفت والوں نے کہا کہ اس سے نتائج کچھ نکل ہی نہیں سکتے۔ نتائج تو معرفت حاصل کرنے کے بعد نکلتے ہیں۔ چنانچہ دونوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ انہوں نے عقل کے چراغ گل کر دیئے

یہی کچھ عیسائیت کے ساتھ ہوا۔ ایک یہودی سینٹ پال عیسائی ہوا۔ اس نے ایک بالکل نیا دین وضع کیا اور اسے منسوب کیا خدا کی طرف۔ اب ایک نئی قسم کی عیسائیت سامنے آگئی کہ اگر چور تمہارے ہاں آکر گٹھری باندھ کر اٹھا نہ سکے تو خود اٹھ کر اس کے سر پر گٹھڑی رکھ دو۔ کیونکہ یہ دنیا کا مال جہنم ہے — ان عقائد کی سند کیا تھی؟ براہ راست علم! اس سے پہلے تصوف انفرادی چیز تھی — لیکن اب یہ منظم طریقے سے سامنے آگئی۔ مختلف مقامات پر خانقاہیں موجود تھیں جن کے اپنے اپنے قواعد تھے۔ مذہبی فرقے والوں کی طرح ان خانقاہوں والے بھی ایک دوسرے سے الگ اور مخالف تھے ایک کہتا تھا کہ حقیقت وحدت الوجود ہے۔ دوسرا کہتا تھا حقیقت وحدت الشہود ہے۔ تصوف کی یہ بنیادی

خصوصیات BASIC CHARACTERISTICS ہیں۔ ان کے ہاں تصوف کی بنیادی چیز یہ بتائی جاتی ہے۔ کہ اگر حواس کی آنکھیں بند کر کے دل کی آنکھیں کھولی جائیں تو خدا اور اس کا بیٹا بے نقاب ہو کر سامنے آتے ہیں۔

برادران! کسی قوم کو تباہ کرنے اور محکوم بنانے کے لئے اس سے بڑا حربہ اور کوئی نہیں ہوتا کہ اس کے اندر یہ عقائد رائج کر دیئے جائیں کہ مادی دنیا فریب ہے۔ ایک باہوش قوم کو بے ہوش کر کے جو چاہے ابدالآباد تک اس پر حکومت کرتا جائے۔ حضرت عیسےٰ کے متعلق یہ تصور کہ وہ فقیر بے نوا تھے بالکل غلط ہے۔ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ ہر نبی کی طرح ایک انقلابی نبی تھے۔ ان کی تختی پر جو ان کا جرم لکھا گیا تھا وہ یہ تھا کہ یہ شخص بنی اسرائیل کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ چنانچہ عیسائیت کے اندر یہ عقیدہ داخل کیا گیا کہ عالمِ غیب کو دیکھنا چاہتے ہو تو عقل و حواس کو چھوڑ دو اور اپنے آپ کو اس میں جذب کرنے کی کوشش کرو جو عالمِ ماورا ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ اس نور کی شعاع کامل تاریکی میں آتی ہے اس لئے ترکِ دنیا، مرشد کی اطاعت، اور خاموشی ضروری ہیں۔ پہلے نور کی ایک کرن دکھائی دیتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ تارکِ دنیا نور میں غرق ہو جاتا ہے۔ دنیا داروں کی نظر میں وحشی نظر آنے لگتا ہے لیکن وہ منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے اور بالآخر وہ نور میں مدغم ہو جاتا ہے۔ صوفیوں کا ایک فرقہ ہے اس میں ہر ایک کو دلہن کہا جاتا ہے — عیسائیوں کے ہاں ان کو آسمانی دلہنیں کہا جاتا ہے۔ یہ تصور یہاں سے پیدا ہوا کہ انسان کا خدا کے ساتھ تعلق دلہن کا ہوتا ہے۔ یہ NUNS خدا کی دلہنیں ہیں۔ ان کے ساتھ اس کا تعلق عروسی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہ تصور وہیں سے لیا گیا ہے۔ جب کوئی بزرگ مرتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کا وصال ہو گیا اور اس کا عرس ہوتا ہے۔ یہ — ORGANISED MYSTICISM — کا سلسلہ بڑھتا گیا تا آنکہ چوتھی، پانچویں، اور چھٹی صدی عیسوی میں بستیاں ویران ہو گئیں اور جنگل آباد ہو گئے۔

یہ تصوف جس کی بنیاد یونان میں افلاطون نے قائم کی بعد میں ایران اور اسی راستے سے ہندوستان میں پھیلتی گئی۔ ایرانی شاعری میں جو ساقی، میکدہ، بتکدہ اور شراب وغیرہ کے قصے ہیں یہ محض شاعری نہیں۔ ان کے ہاں خانقاہوں کے اندر یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ ہندوستان میں بہت پہلے ویدانت وحدت الوجود تھا۔ شنکر اچاریہ نے کہا کہ معرفت نفس زندگی کا اصول ہے۔ خارجی دنیا فریب ہے۔ اصل دنیا باطنی ہے۔ برہما کو معلوم کرنے کا طریقہ گیان دھیان ہے۔ ادھر شام اور فلسطین کا علاقہ خانقاہوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ تھے وہ علاقے جن کو یکے بعد دیگر مسخر کرنے کے لئے مسلمان ان میں داخل ہوئے۔ اسلام کے ظہور سے قبل شام اور فلسطین تصوف کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ فلسطین میں

پہاڑیوں کا سلسلہ تھا جن کے اندر غاریں تھیں۔ جن کا منہ چھوٹا تھا اور اندر سے بہت کشادہ تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں Saints اور درویش ان کے اندر رہتے تھے۔ سہل انگاری فریب دہی عام تھی شہوت پرستی اور بدمعاشی عروج کو پہنچ چکی تھی۔ راہب ہر جگہ پھرتے تھے اور بدترین وارداتوں کے مرتکب ہوتے تھے۔ مذہبی دکاندار لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر انہیں آلۂ کار بنا رکھتے تھے۔ یہ تمام تحریکیں عقل کو سلب کرنے کے ذرائع تھے۔

قرآن آیا اور اس نے عقل کے دیئے جلا دیئے۔ تاریکی کا کوئی مقام نہ رہا۔ قرآن کریم میں تصوف کا لفظ تک موجود نہیں۔ چونکہ کوئی تصور نہیں تھا اس لئے لفظ بھی موجود نہیں۔ قرآن کریم میں سیدھے سادھے قوانین ہیں۔ یکسر عمل اور معاشرے کے قیام کی ہدایت ہے۔ حضورؐ اور ان کے بعد دو اوّل کا مسلمان صرف قرآن پر عمل کرنے والا تھا چنانچہ کسی عیسائی نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ ہر قوم کے نظریئے کی حقیقت ہوتی ہے جو اس نظریئے کی صداقت کا ریکارڈ ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ تمہارے کلمہ کی حقیقت کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ چھتیس ہزار قلعے اور شہر ہمارے کلمہ کی حقیقت ہیں۔ تاریخ اسلام کی پہلی صدی میں کہیں تصوف کا نام تک موجود نہیں۔ مسلمانوں میں پہلا شخص ابو ہاشم تھا جس کی خانقاہ ۱۰۰ھ میں قائم ہوئی۔ یہ کوفے کا رہنے والا تھا اور ایران کے ان مجوسیوں میں سے تھا جو OVER NIGHT مسلمان ہو گئے تھے۔ جب ایران فتح ہوا تو ان لوگوں نے فائدہ اسی میں دیکھا کہ مسلمان ہو جائیں اور جو شکست انہیں میدان جنگ میں ہوئی تھی اس کا بدلہ مسجدوں اور خانقاہوں میں لیں۔ چنانچہ یہ لوگ رب کو بھی مانتے تھے اور دل کے اندر بت بھی سجائے رکھتے تھے۔ چنانچہ اب مردِ مومن نے مومن کی بجائے صوفی کہلانا شروع کیا۔ جو کچھ پہلی امتوں کے ساتھ بیت چکا تھا وہی ان کے ساتھ ہونا شروع ہوا۔ کچھ عرصہ ایرانی تصورات چھپے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ لٹریچر میں انہوں نے جگہ لی۔ وہی یہودیوں والی وحی جلی اور وحی خفی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یعنی یہ کہ وحی جلی تو رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ختم ہو گئی لیکن وحی خفی کا سلسلہ جاری ہے اور یہی صوفیوں کے کشف ہیں۔

وحی خفی کی نہ قرآن میں کوئی سند ہے اور نہ حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ خدا سے براہ راست علم حاصل کرنے کا سلسلہ کہیں لکھا ہوا منتقل نہیں ہوتا۔ یہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے۔ اس سلسلے کو پیچھے شروع کر کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک لے جایا جاتا ہے۔ تصوف والوں کا عقیدہ ہے کہ خلافت ارضی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے پائی۔ لیکن خلافت روحانی حضرت علیؓ سے شروع ہوتی ہے یہ باطنی علم کا سلسلہ حضرت علیؓ سے شروع ہو کر حسن بصریؒ کے ذریعے شجرہ نسب کو آتا ہے۔ حالانکہ کوئی

شہادت موجود نہیں کہ حسنؒ بصری کی کبھی حضرت علیؓ سے ملاقات بھی ہوئی تھی یا نہیں۔ کہاں وہ اسلام کہ جہاں مومن کی کیفیت یہ بیان کی گئی تھی کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو اس میں مصروف ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو اور کہاں یہ زندگی کہ کمرے میں بیٹھے ہوئے "سیروا فی الارض" کا وظیفہ ہو رہا ہے۔ تصوف پھیلتی گئی حتیٰ کہ مسلمانوں کے اندر ایک منظم شکل اختیار کر گئی اور ایک فلسفہ بن گئی۔ سب سے پہلے محی الدین ابن عربی نے اس فلسفے کو پیش کیا۔ دماغی اعتبار سے یہ بہت اونچے تھے اور اگر ایسا شخص کوئی غلطی کر جائے تو اس کے نتائج بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ابن عربی اس دور میں جو کر گئے وہ مسلمانوں کی رگ و پے میں گھس گیا۔ یہ وحدت الوجود کے قائل تھے اور اس کی سند بھی قرآن کریم سے پیش کرتے ہیں۔ سورہ طٰہٰ میں ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى۔ (۲۰/۵۵)

(ہم نے تم کو (مٹی سے) پیدا کیا اسی میں تمہارے اجزاء پھر جذب ہو جائیں گے اور اسی سے ہم تمہیں پھر نکالیں گے۔

ابن عربی کہتے ہیں کہ سب انسان احدیت سے نکلے تھے اور پھر اسی میں فنا ہو جائیں گے۔ حالانکہ ذکر یہاں ارض کا ہے احدیت کا کوئی ذکر نہیں۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ جس مقام سے نبی کو وحی ملتی ہے اسی مقام سے انسانِ کامل، غوث اور قطب لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ نام قرآن میں کہیں موجود نہیں۔ ختمِ نبوت کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا جو کچھ انسانوں کو ملنا تھا مکمل شکل میں مل گیا۔ لیکن ان لوگوں نے چور دروازے کھول دیئے ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم میں درج ہے کہ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے اس میں غلطی ہو سکتی ہے۔ لیکن اولیاء کو چونکہ علم براہِ راست ملتا ہے اس لئے اس میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ اولیاء خود خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں خدا ان کو وہی دیتا ہے جو انبیاء کو دیتا ہے۔ ابن عربی لکھتے ہیں کہ فرعون جن بچوں کو قتل کرتا تھا ان کی زندگی حیاتِ موسیٰ بن جاتی تھی۔ فرعون کو حق حاصل تھا کہ "انا ربکم الاعلیٰ" کہے کیونکہ وہ فرعون کی شکل میں تھا لیکن حق سے الگ نہیں تھا۔ ان کا دعوےٰ ہے کہ قرآن سے ہم نے مغز لیا ہے اور الفاظ جو ہڈیاں ہیں وہ کتوں کے آگے ڈال دی ہیں۔

چنانچہ برادران! ہر چیز خدا سے براہِ راست لینے کے دروازے کھل گئے اور ہر قسم کے معجزات اور کرامات وجود میں آنے شروع ہو گئے وہی معجزے جو کوئی غیر مسلم یا کوئی HYPNOTIST دکھا سکتا ہے حالانکہ مومن کی کرامات یہ ہیں کہ زمین و آسمان کو مسخر کرے اور ان قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق عمل میں لائے تاکہ اس کا مقام ارض و سمٰوٰت سے بھی آگے جا سکے۔ یہ ہے تصوف کی مختصر تاریخ۔ نزول

قرآن کے دقت اس کی کیفیت اور یہ کہ یہ اسلام میں کیسے داخل ہوا۔ اس کے بعد جو صوفیائے کرام گزرے ہیں ان کے عقائد، وہ معجزات جو ان کیطرف منسوب ہیں اور ان کی کرامات کے دیگر قصے کہانیاں، ــــ یہ ایک الگ دلچسپ باب ہے جس کی طوالت کے پیشِ نظر میں اس تفصیل میں گئے بغیر آگے بڑھتا ہوں۔

اب میں گزارش کروں گا کہ قرآن کریم کی روشنی میں تصوف کی حقیقت کیا ہے۔ جس چیز کو قرآن مٹانے کے لئے آیا تھا وہ عین دین بن جائے تو اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ دین کا معیار اللہ کی کتاب ہے ہر نظریئے کو اس کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔ اگر صحیح اترے تو اُسے دین تصور کرنا چاہیئے ورنہ نہیں۔ تمہیداً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ نے انسان کو عقل دی۔ علم حاصل کرنے کے وہ طریق بتائے جو حیوانات میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں۔ انسان کا انسان ہونا اسی علم و عقل کے شرف کی وجہ سے ہے۔ انسان علم حاصل کرتا ہے اول آنکھ اور کان کے ذریعے۔ دوئم مشاہدات سے، سوئم تجربات سے۔ یہی تین طریقے انسانوں کے علم حاصل کرنے کے ہیں لیکن اس میں ایک استثنا بھی ہے جس کو قرآن وحی کہتا ہے اور جو صرف انبیائے کرامؑ کو ملتی ہے۔ غیر از نبی جان نہیں سکتا۔ کہ یہ وحی کا علم کیسے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ علم انبیاء کو براہ راست ملتا ہے اور اس کے لئے نازل ہونے کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ یہ عام انسانوں کے علم حاصل کرنے سے ایک الگ طریقہ ہے۔ وحی کے متعلق نبی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ نبی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اُسے یہ علم ملنے والا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (۵۲/۴۲)

اس طرح ہم نے اپنی وحی تم پر نازل کی تو اس سے پیشتر جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں۔ اور ایمان کسے کہتے ہیں؛

عام انسان جب علم حاصل کرتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ حصولِ علم میں اس حد تک پہنچ گیا ہوں لیکن نبی کو اس وقت تک اس کا پتہ نہیں ہوتا جب تک کہ حقیقت کا انکشاف اس پر نہیں ہو جاتا۔ حقیقت کے پردے وہ خود نہیں اُٹھاتا بلکہ حقیقت خود اس کے سامنے آجاتی ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (۲۸/۸۶)

تمہیں توقع ہی نہ تھی کہ تم پر یہ کتاب نازل کی جائے گی مگر یہ تمہارے پروردگار کی رحمت ہے؛

چنانچہ علمِ وحی کا حصول اپنی کوشش کا نتیجہ نہیں۔ یہ علم پہنچانے کا سلسلہ بہت پہلے شروع ہوا تھا اور نبی آخر الزمانؐ تک پہنچ گیا۔ اور اللہ تعالےٰ نے اعلان کر دیا کہ جو ہدایت انسانوں کو دینی تھی وہ پوری ہو گئی۔ اسکے

بعد اب اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۔ (۶/۱۱۵)

تیرے رب کے دیئے ہوئے تصورات صدق اور عدل کے ساتھ پورے ہو گئے اب ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔

اگلی چیز سامنے آتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز مکمل ہو جائے لیکن اس کے بعد کھو جائے۔ چنانچہ کہہ دیا کہ۔

نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ (۱۵/۹)

ہم نے اس قانون کو نازل کر دیا اور اب ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں؛

چنانچہ اب وحی کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد حصولِ علم کے وہی ذرائع رہ گئے جو عام انسانوں کے ہیں۔ وحی قرآن میں محفوظ ہو گئی اور تاکید کی گئی کہ اپنے ذرائع علم کو کام میں لا کر قرآن پر غور و فکر کرتے جاؤ۔ قرآن نے کسی جگہ اشارۃً بھی نہیں کہا کہ ختمِ نبوت کے بعد انسانوں کے لئے عام طریقوں سے الگ بھی کوئی ذریعہ علم حاصل کرنے کا ہے تصوف کا بنیادی نظریہ اور عقیدہ یہ ہے کہ عام انسانی ذرائع کے علاوہ ایک اور ذریعہ ہے جس سے خدا سے براہ راست علم حاصل کیا جا سکتا ہے حالانکہ قرآن نے بالوضاحت کہا کہ براہ راست ذریعہ نبی اکرمؐ پر ختم ہو گیا کہا جاتا ہے کہ وہ وحی تھی اور یہ کشف اور الہام ہے۔ لیکن نام کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ کیا اس دعویٰ کی کوئی سند ہے، قرآن میں کشف اور الہام کا کہیں ذکر ہی نہیں، صرف ایک جگہ دل دھم کا لفظ آیا ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔ (۹۱/۷-۱۰)

انسانی ذات کی تخلیق اس انداز سے ہوئی ہے کہ اس میں وہ قوتیں بھی رکھ دی گئی ہیں جن سے انسانی ذات کی (انتشار) DISINTEGRATION ہوتی ہے اور وہ قوتیں بھی جن کی رُو سے یہ اس انتشار یا BREAKING UP PROCESS سے محفوظ رہ سکے۔ جس نے ان مثبت صلاحیتوں کو نشو و نما دی وہ کامیاب و کامران ہوا اور جس نے تخریبی قوتوں کا سہارا لیا وہ ناکام ہوا؛

یہاں ما دل دھم کے معنے ہیں کسی شے کو کسی چیز میں رکھ دینا۔ سارے قرآن میں یہ کہیں موجود نہیں کہ جس چیز کو یہ لوگ الہام کہتے ہیں اس کے ذریعے سے علم ملتا ہے۔ ایک اصطلاح وضع کر لی اور اس کا مفہوم عین وحی کے مطابق رکھ لیا۔ خدا سے براہ راست علم حاصل کرنا وحی کی تعریف ہے اور یہی تعریف الہام کی بنائی گئی ہے وحی کے متعلق آپ دیکھ چکے ہیں کہ وہ جس شخص کو ملتی ہے اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی لیکن

الہام کو ہر شخص محنت اور ریاضت سے حاصل کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ لوگ انبیاء سے بھی آگے چلے گئے انبیاءؑ کے پاس وحی کا سلسلہ ہر وقت جاری نہیں رہتا تھا لیکن ایک ولی، جب چاہے اپنے آپ پر الہام لے آتا ہے یعنی صاحبِ الہام نے اسے بطور حق کے حاصل کیا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی وحی کی اس خصوصیت کو کہ یہ کسبِ ہنر سے حاصل نہیں کی جا سکتی' اسے بھی توڑ دیا۔ جو چیز حاصل ہوتی ہے یہ وہی ہے جو ہم اور آپ کی نظروں سے اوجھل ہے اور جسے ہم عام ذرائع علم سے حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی کو غیب کا علم کہتے ہیں۔ غیب کے متعلق قرآن کہتا ہے۔

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ (۱۰/۲۰) اے رسول اعلان کر دے کہ غیب خدا کے لئے ہے۔

دوسری جگہ ہے:-

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (۲۷/۶۵) کہہ دو کہ زمین اور آسمان میں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جسے غیب کا علم ہو۔

خود حضور نبی اکرمؐ کی زبانی کہلوا دیا:

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ - (۶/۵۰)

میں تم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور میں غیب کا علم بھی نہیں جانتا۔

اب بتائیے کہ نبی اکرمؐ سے بڑا انسان کون ہو سکتا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ جس رسولؐ کو غیب کا علم دیا جاتا ہے وہ ہر وقت غیب کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ حضرت مریم کے قصے میں کہا گیا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ - (۳/۴۳)

یہ واقعات وہ ہیں جو نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور ہم تمہیں اے رسول! ان کا علم وحی کے ذریعے دے رہے ہیں۔

یعنی وحی کے علاوہ یہ الہام والی بات رسول میں بھی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے اس واضح اعلان کے بعد کہ جو قانون وحی کے ذریعے دینا تھا وہ اب کتاب میں محفوظ ہو گیا ہے۔ یہ عقیدہ کہ غیب کا علم براہ راست حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کتنی بڑی جسارت ہے۔ لیکن یہ لوگ صرف یہی نہیں کہتے کہ غیب کا علم براہ راست حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کو دیکھا بھی جا سکتا ہے پھر خدا سے ہمکلامی ہوتی ہے جھگڑے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرآن کا واضح اعلان یہ ہے کہ۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ - (۶/۱۰۴) کوئی نگاہ خدا کو نہیں دیکھ سکتی۔

دوسری جگہ ہے :-

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ ۔ (۲/۵۵)

اور جب تم نے (بنی اسرائیل نے) کہا کہ موسےٰ جب تک ہم خدا کو آمنے سامنے نہ دیکھ لیں گے ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے تو تم کو بجلی نے آگھیرا۔

جس چیز سے یہ تصور ملتا ہے کہ اس سلسلۂ کائنات کو چلانے والی کوئی شے ہے اسے آیت کہتے ہیں۔ یعنی ایسی شے جس پر آپ کو رُک کر کھڑا ہونا پڑے۔ اور غور و تدبر کرنا پڑے۔ قرآن میں صرف آیت اللہ کا ذکر ہے لیکن جسے معرفت کہتے ہیں یہ چیز ممکن ہی نہیں۔ ذات خداوندی کا تصور انسان نہیں کر سکتا کیونکہ وہ لامحدود ہے اپنے ذہن پر کتنا زور دیجئے۔ آپ وقت کے آغاز کو ذہن میں نہیں لا سکتے۔ فضا کی آخری حد کو ذہن میں نہیں لا سکتے چہ جائیکہ انسان کا محدود ذہن ذاتِ خداوندی جیسی لامحدود ہستی کو اپنے احاطے میں لا سکے۔ حضورؐ نے یہ کبھی نہیں کہا کہ انہیں عرفان حاصل ہوا ہے۔ قرآن میں خدا کے عرفان کا تقاضا نہیں صرف آیاتُ اللہ پر ایمان کا ذکر ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی حکیم ہے کوئی خالق ہے۔ جو اس کارگہِ عالم کو چلا رہا ہے۔ ان معرفت والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کو روحانی قوتیں حاصل ہیں۔ انسان کی زندگی کا مقصد ان روحانی قوتوں میں اضافہ کرنا ہے۔ انسان کے اندر جو روح ہے وہ خدا کی روح کا ایک حصہ ہے۔ وہاں سے الگ ہو کر یہ مادی پیکروں میں پھنس گئی ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ اس روح کو اب نکھار کر خدا کے پاس رکھ دینا ہے۔ یہ تزکیہ ہے اور یہی مقصودِ زندگی ہے۔

لیکن سوچئے کہ یہ عظیم کارگاہِ حیات کیا اسی مقصد کے لئے ہے؟ قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ خالص افلاطون کا تصور ہے۔ ان کے ہاں دو تصورات مقبول ہیں۔ اول یہ کہ مادی کائنات قابلِ نفرت شے ہے دوئم یہ کہ روح اور مادہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ روح کو مادہ کی آلائش سے الگ رکھا جائے۔ چنانچہ تصوف کی بنیاد اس چیز پر ہے کہ ہر چیز کو ترک کر دو حتےٰ کہ ترکِ آرزو اس کی انتہا ہے۔ یعنی تکالیف سے بچ نکلنے کا طریق یہ ہے کہ دل میں کوئی آرزو نہ ہو۔ ترکِ آرزو خالص بدھ کی تعلیم ہے۔ ترکِ دنیا عیسائیت کی تعلیم ہے دنیا آلائش ہے ویدانت کی تعلیم ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو چیز ہے وہ تمہارے لئے مسخر کر دی گئی۔ جتنا تسخیر کرتے جاؤ گے اتنی تمہاری نشوونما ہوتی جائے گی۔ یعنی قرآن میں تزکیہ سے مراد تسخیر کائنات کے ذریعے نشوونما ہے ——

کتنا بڑا انقلاب انگیز اعلان ہے!

(باقی آئندہ)

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم گھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں نئے انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے **مکمل سیٹ** کی رعایتی قیمت **پچاس** روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دل کش مرقع۔ قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) چیپ ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دل کش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔
جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین۔ مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت۔ بارہ روپے

نظام ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برق طور — صاحب ضرب کلیمؑ اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان' جو یوں کہیئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت علیؓ کی بصیرت افروز داستانِ حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پروفیسر صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام
ضحی الاسلام — مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکہ آراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔
(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ جلد پہلی جلد آٹھ روپے۔ دوسری اور تیسری جلد (آٹھ روپے فی جلد)

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور دانشمندوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا تعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد چوتھی جلد بارہ روپے بعض حصے ختم ہو چکے ہیں۔

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی۔ معاشی سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ - آٹھ روپے سستا ایڈیشن - چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵ بی۔ گلبرگ ۔ لاہور